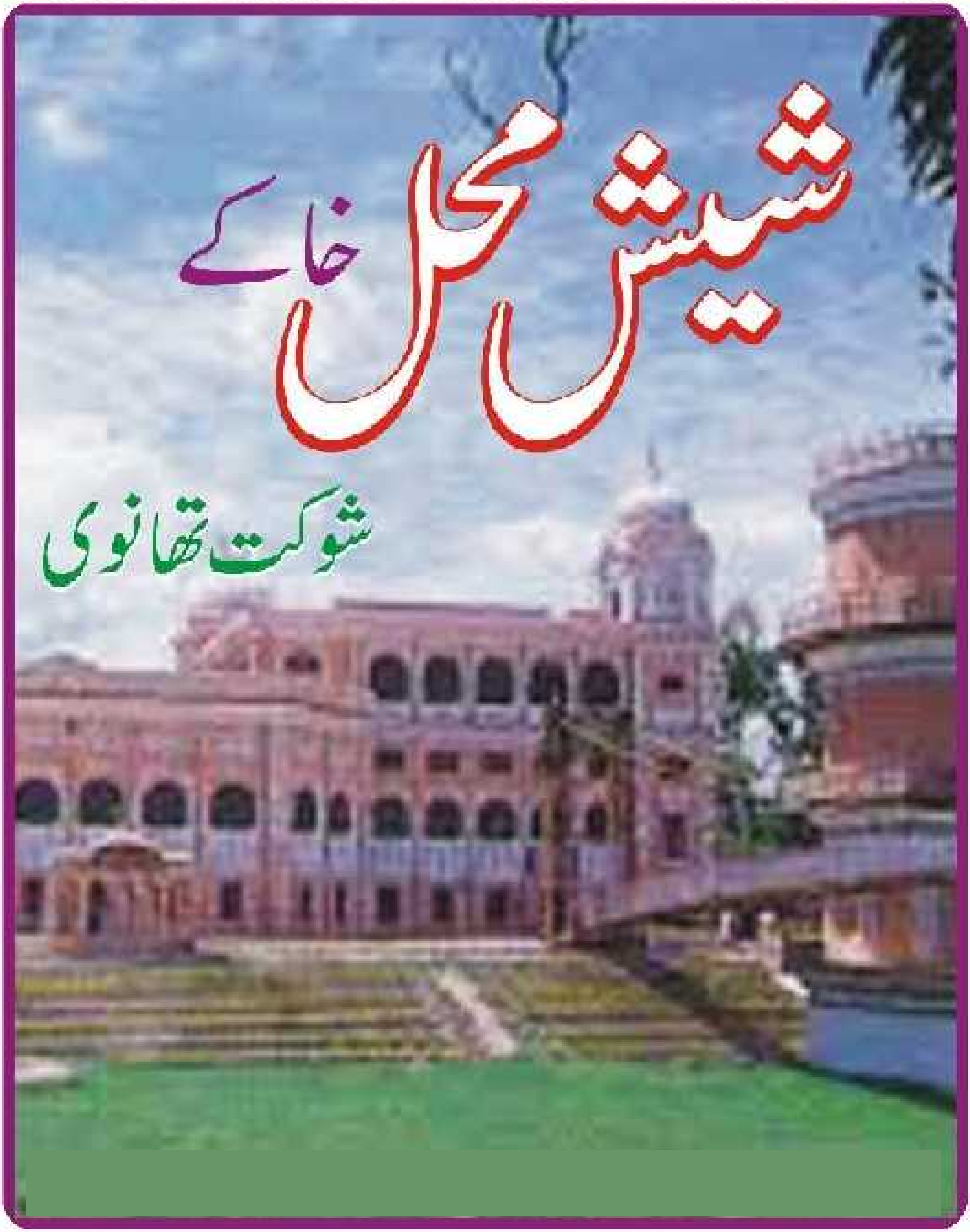

شیش محل

خاکے

شوکت تھانوی

آرزو لکھنوی

مجھے اپنے مزاح نگار ہونے کی قطعاً اطلاع نہ تھی۔ البتہ والد صاحب سے چھپ چھپ کر ناموزوں شعر کہا کرتا تھا۔ یہ ذکر ہے غالباً اب سے بیس بائیس سال پہلے کا۔ طالب علمی کا زمانہ تھا اور امتحانوں میں فیل ہونے کا سلسلہ جاری...... ایسی صورت میں اگر شاعری کی اطلاع والد صاحب کو ہو جاتی تو خدا جانے ہم کو اپنا تخلص کہاں چھپانا پڑتا۔ اسی زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مشاعرے کا اعلان ہوا۔ مصرعہ تھا ڈاکٹر اقبال کا

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

چھوٹی چھوٹی بحروں میں مصرعوں کے وزن کا سنبھالنا دوبھر تھا۔ پھر یہ تو اچھی خاصی تندرست قسم کی بحر تھی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ غزل کہی اور اپنے نزدیک چھ سات شعر موزوں نکال ہی لیے (حالانکہ اب دیکھنے سے پتہ چلا ہے کہ صرف ڈیڑھ شعر موزوں تھا۔ باقی تمام اشعار میں یا تو ایک آدھ رکن کم تھا یا زیادہ) ایک مطلع یاد ہے۔

نظر آ رہی ہیں جو ان دنوں ترے حسن میں ترے ناز میں
یہی صورتیں ہیں وہ صورتیں جو کبھی تھیں پردۂ راز میں

کس قدر لغویت میں ڈوب کر کہا گیا تھا۔ بہرحال مشاعرے میں پہنچے۔ دوسروں کا کلام سنا۔ ٹھیک سے داد دینا بھی نہ آتی تھی۔ بجائے داد دینے کے ایک آدھ مرتبہ بے ساختگی میں داد دیتے ہوئے شاعر کو سلام بھی کر لیا۔ اپنی غزل بید کی طرح کانپ کانپ کر پسینہ میں شرابور ہو کر اور خدا معلوم کن سروں میں جوں توں سنائی۔ مشاعرے کے آخر میں جن صاحب نے اپنا کلام سنایا وہ تھے سید انور حسین آرزو لکھنوی۔

ان کا مطلع اب تک یاد ہے۔

یہ گل رضائے حبیب ہے اسے ڈھونڈھ محفل ناز میں
مرا سجدہ داغ ریا نہیں جو ملے جبین نیاز میں

صورت قطعاً غیر شاعرانہ کلام سے نرے شاعر، خود گراں گوش اور کلام جنت گوش اشعار میں ترنم اور پڑھتے ہیں تحت اللفظ۔ داد کے الفاظ مشکل سے سنتے ہیں مگر سلام دونوں ہاتھوں سے کرتے ہیں۔ ہم اگر ان کو مشاعرے میں نہ دیکھتے تو زیادہ سے زیادہ کوئی حکیم سمجھتے۔ اس مشاعرے کے بعد سے پھر تو اکثر دیکھا۔ کلام سنا اور مختلف جگہ پڑھا۔ خالص اردو شاعری کے نمونے دیکھے۔ آپ کے لکھے ہوئے

ڈرامے دیکھے۔ آپ کے گیت سنے۔ آپ سے مشاعروں کے علاوہ یوں بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ مگر ہمیشہ آپ کو اس قدر سنجیدہ اور باضابطہ پایا کہ گویا نجی مراسم میں بھی آپ عروض کا ہر وقت خیال رکھتے ہیں کہ سنجیدگی کا کوئی رکن کہیں سے گرنے نہ پائے۔ دوسری خصوصیت اس بیس بائیس سال میں ہر مرتبہ یہ نظر آئی کہ گویا صحت ہمیشہ کچھ نہ کچھ خراب ہی رہتی ہے۔ سچ ہے کہ حد کو پہنچی ہوئی سنجیدگی عارضہ بن کر رہ جاتی ہے۔

◆◆◆

آسی

یہ اسی زمانے کا ذکر ہے۔ جب یہ خاکسار نہایت خفیہ طور پر ناموزوں شعر کہا کرتا تھا۔ اور والد صاحب سے دو ہی باتوں میں ڈر معلوم ہوتا تھا کہ ایک تو خدا وہ دن نہ لائے کہ وہ ہم کو سگریٹ پیتے دیکھ لیں اور خدا اس برے وقت سے بھی محفوظ رکھے جب ان کو یہ اطلاع ہو کہ صاحبزادے شاعر ہوتے جاتے ہیں، روز بروز۔ مگر آپ نے سنا ہوگا کہ گیدڑ کی جب موت آتی تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ چنانچہ اس شاعری کی جو شامت آئی تو وہ اپنی ایک غزل جو بزعم خود شاہکار کا درجہ رکھتی تھی اور جس کو جھوم جھوم کر تنہائیوں میں گنگنایا جاتا تھا۔ لکھنو کے رسالہ ’’ترچھی نظر‘‘ میں چھپنے کے لیے بھیج دی۔ رسالے کے نام سے ظاہر ہے کہ معیاری رسالہ تھا وہ جس کا نام تھا ’’ترچھی نظر‘‘ کیا تاریخی اسم مبارک تھا۔ بہرحال اس رسالہ میں ہمارا کلام شائع ہو گیا اور...... ’’بہر خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجیے‘‘ والی التجا آخر قبول ہو کر رہی۔

اب فکر یہ تھی کہ تمام گھر والے، تمام اہل خاندان، تمام آئے گئے، مختصر یہ کہ سب ہی اس چھپی ہوئی غزل کو دیکھیں اور اندازہ کریں کہ جس جوہر قابل کو محض امتحانوں میں فیل ہونے کی وجہ مستقلاً نالائق سمجھ لیا گیا ہے وہ دراصل ہے کیا چیز۔ اور اس پامال ہونے والے ذرے میں آفتاب بننے کی کیسی بھرپور صلاحیتیں موجود ہیں۔ رسالہ دانستہ ایک عام جگہ کھلا ہوا چھوڑ دیا گیا۔ شامت اعمال سب سے پہلے والد صاحب کو کتب بینی کا شوق ہوا۔ چشمہ لگا ہی ہوا تھا، رسالہ پر نظر جو پڑی تو لخت جگر کا نام پڑھ کر اچھل پڑے۔ غزل کو شروع سے آخر تک حیرت کے ساتھ پڑھا۔ والدہ صاحبہ کو آواز دی اور نہایت عبرت انگیز طریقہ پر غزل سنا کر مقطع سے پہلے والا شعر پڑھا گیا۔

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچہ میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

کہنے لگے، کوئی پوچھے ان صاحبزادے سے کہ آپ آخر ان کے کوچہ میں جاتے ہی کیوں ہیں؟ والدہ صاحبہ ہنس دیں تو والد صاحب نے سنجیدگی سے کہا کہ شوق برا نہیں ہے۔ مگر قبل از وقت ہے۔ املا تک تو برخوردار کا درست نہیں اور چلے ہیں شاعر بننے۔ یہ ریمارکس ہم نے خود سنے حوصلے پست ہونے ہی کو تھے کہ شیطان نے کان میں کہا کہ ’’واہ حضرت شاعر بنتا نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے، تم بھی کوئی عرائض نویس ہو کہ املا درست کرتے پھرو۔ تم کو خدا نے شاعر بنایا ہے بس شعر کہے جاؤ۔ مختصر یہ کہ مشق سخن جاری رہی۔ رسالہ ’’ترچھی نظر‘‘ نکلتا رہا اور غزلیں چھپتی رہیں۔ یکا یک ایک مرتبہ جو رسالہ آیا تو دیکھتے کیا ہیں کہ سائز بدلا ہوا ہے۔ رسالہ کا نام بھی بدل گیا۔ ’’ترچھی نظر‘‘ کے بجائے صرف ’’نظر‘‘ رہ گیا ہے۔ اور ایڈیٹر بھی کوئی نئے صاحب ہو گئے ہیں...... امین سلونوی۔

رسالہ کے ساتھ ہی ایک خط بھی امین سلونوی صاحب کا ملا، کہ میں آپ سے کسی وقت ملنا چاہتا ہوں، خود تشریف لائیے یا مجھ کو بلائیے۔ اللہ اکبر اپنی اہمیت کا پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ اتنا بڑا ایڈیٹر ہم سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم واقعی کچھ ہیں ہی بڑے آدمی۔ فوراً خط ہاتھ میں لیا، شیروانی پہنی اور رسالہ ''نظر'' کے دفتر جا پہنچے۔

امین سلونوی صاحب کو خود ان ہی سے پوچھا۔ وہ اپنی مونچھوں کے تاؤ کے ساتھ گویا اڑے جا رہے تھے۔ بہت اخلاق سے ملے۔ دیر تک ادبی گفتگو ہوتی رہی۔ ان کو ہم نے اپنی ہی قسم کا آدمی پایا۔ پھر کیا تھا، روز آنے جانے لگے۔ کبھی وہ ہمارے یہاں کبھی ہم ان کے یہاں۔ ایک دن امین سلونوی صاحب نے باتوں ہی باتوں میں مشورہ دیا کہ تم شعر کہتے ہو تو کسی کے شاگرد ہو جاؤ۔ رائے تو مناسب تھی۔ مگر استاد بنانے کے لیے کوئی صاحب فوراً ذہن میں نہ آئے۔ امین صاحب نے اپنے استاد کا ذکر کیا۔ ہم نے کہا، بس یہ ٹھیک ہے۔ اتنے بڑے ایڈیٹر کا استاد اگر ہمارا استاد بن گیا تو ہم کچھ فائدے ہی میں رہیں گے۔ امین صاحب کے ساتھ ان کے استاد کے یہاں پہنچے۔ کبوتروں کی ڈھابلیوں سے لبریز صحن سے گزر کر ہم لوگ ایک دالان میں پہنچے جہاں ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ ایک نہایت ضعیف العمر شخص سے بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے۔ انتہائی انہماک کے ساتھ یعنی ایسا انہماک کہ بغیر چلم کے حقہ وہ ضعیف العمر صاحب مسلسل پی رہے تھے۔

شطرنج کی بازی کے بعد امین صاحب نے تعارف کی رسم ادا کی۔ مولانا آپ میرے دوست شوکت تھانوی صاحب ہیں اور شوکت صاحب آپ میرے استاد مولانا عبدالباری آسی ہیں۔ دونوں طرف تبسم، دونوں طرف سے ''بڑی خوشی ہوئی'' والا رسمی جملہ۔ میں نے کہا ''میں برابر آپ کا کلام پڑھتا ہوں اور آپ کا ایک شعر میرے دل پر نقش ہے۔

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئین وفا بدلا

مولانا آسی ہمارے حسن انتخاب پر خوش ہوئے اور فوراً پان عطا فرمایا۔ تھوڑی دیر کے بعد امین صاحب نے ہم کو مولانا آسی کی شاگردی میں پیش کر دیا اور مولانا از راہ شفقت قبول فرمالیا۔

مولانا آسی کے شاگردوں کی فوج ظفر موج میں ایک رنگروٹ کا گویا اضافہ ہوگیا۔ ایک قریبی مشاعرے کے لیے غزل کہنے کا حکم ملا۔ ہم غزل بھلا کا خاک کہتے وہی چند موزوں اور کثرت سے ناموزوں بے ربط مصرعے کہہ کر لے آئے۔ مولانا نے غزل خود کہی اور اس میں تبرک کے طور پر شاید ہمارا ایک آدھ مصرعہ رہنے دیا۔ اسی طرح دوسرے شاگردوں کی غزلیں بھی مولانا نے دیکھیں کہ ان کے شعر دال میں نمک کے برابر اور اپنے شعر نمک میں دال کے برابر۔ البتہ حیرت یہ ہوتی تھی کہ مولانا شعر اس طرح کہتے تھے گویا ٹائپ رائٹر کچھ لکھتا چلا جا رہا ہے۔ ایک دو تین چار...... مختصر یہ کہ اسی طرح مشاعرہ پر مشاعرے ہونے لگے اور ہم لگے اچھلنے۔ پڑھنا بھی آ گیا۔ داد لینا اور دینا بھی آ گیا۔ شاعر بن گئے، مگر استاد کے بل بوتے پر۔ البتہ رفتہ رفتہ یہ ضرور معلوم ہوگیا کہ شعر دراصل ہوتا کیا ہے۔ اچھا شعر کسے کہتے ہیں۔

معمول کی کیا پہچان ہے اور برے شعر کی کیا تعریف ہے۔ آخر مولانا سے کہا کہ اب ہم کو بھی شعر کہنے دیجئے۔ مولانا نے اجازت دے دی اور ہم نے خود جو کوشش کی تو اب دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئی۔ کچھ تک کی باتیں پیدا ہو گئیں اور اب اصلاحی غزلیں پڑھنے لگے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اصلاحیں کم ہوتی گئیں۔

مولانا آسی استاد کم ثابت ہوئے دوست زیادہ بنے۔ انتہائی بے تکلف اور نہایت بے باک قسم کے دوست۔ ان کی رنگینیوں میں ہم ان کے شریک اور ان کی خلوت وجلوت کے آشنائے راز۔ مولانا آسی کے متعلق سینکڑوں رائیں تبدیل کرنے کے بعد آخرکار اس رائے پر پہنچنا پڑا ہے کہ ان کے علم وفضل سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کلام نہایت ٹھوس ہوتا ہے مگر فطرت ایسی ٹھس پائی ہے کہ عجیب بے خودی کا عالم طاری رہتا ہے۔ شیروانی میلی ہے تو خوش ہیں کہ پاجامہ تو اجلا ہے۔ پاجامہ اجلا ہے تو دل مطمئن ہے کہ قمیض بالکل صاف ہے۔ خط بڑھا ہوا ہے تو اطمینان یہ حاصل ہے کہ خضاب کا رنگ تو قائم ہے۔ شوق ہے شطرنج کا اور قلمی کتابوں کا۔ مرغوب ہیں قلمی آم اور الہ آباد کے امرود۔ مشغلہ ہے صرف لکھنا اور پڑھنا اور بیگار ہے شاگردوں سے سر کھپانے کی پہلے صرف صاحب تلامذہ تھے اب بفضلہٖ صاحب اولاد بھی ہیں۔ پہلے تو کہیں نہ کہیں جانے کی وجہ سے لباس کی طرف ایک آدھ دزدیدہ نظر ہو بھی جاتی تھی۔ مگر اب تو بال بچوں میں ویسے بھی کپڑے میلے ہوتے ہی ہیں۔ دوسرے ایک عیالدار کے لیے یہ شوقینیاں کچھ مناسب بھی نہیں ہیں۔ تصانیف کا سلسلہ جاری ہے۔ انسانی بھی اور کاغذی بھی۔ کتابیں بھی ماشاءاللہ بڑھ رہی ہیں اور بچے بھی چشم بددور۔ رہ گئے شاگرد ان کی نہ پہلے کمی تھی نہ اب باوجود اس جنگ کے۔ جتنی مرتبہ در دولت پر حاضری دی ایک نہ ایک نیا رنگروٹ نظر سے گزرا۔ یہ بھرتی پہلے بھی جاری تھی اور اب بھی جاری ہے۔

◆ ◆ ◆

آشفتہ لکھنوی

سید علی نام، طبیب ہیں لہٰذا حکیم، شاعر ہیں لہٰذا آشفتہ، لکھنو وطن ہے چنانچہ لکھنوی۔ اس طرح گویا پورا نام ہوا ’’حکیم سید علی آشفتہ لکھنوی‘‘ طبابت میں حاذق الملک حکیم اجمل خان مرحوم کے شاگرد رشید۔ شاعری میں عزیز لکھنوی کے شاگرد، جوش، روان اور اثر کے پیر بھائی۔

آشفتہ کو میں نے بہت قریب سے دیکھا اور کافی پڑھا ہے۔ ان کے محتاط ہونے میں شک نہیں، کم سے کم جلوتیں تو نہایت محتاط نظر آئیں۔ خلوتوں کی خبر خدا جانے۔ زبان کے معاملہ میں محتاط۔ عروض کے معاملہ میں محتاط۔ طبابت میں اور شاعری میں دونوں جگہ مساوی طور پر اوزان کے مقابلہ میں محتاط۔ لباس کے معاملہ میں محتاط۔ کیا مجال کہ انگرکھے کے چناؤ اور چوڑی دار پاجامہ کی چوڑیوں میں ذرا بھی شتر گربہ پیدا ہو جائے یا کسی کا زبان کے معاملہ میں غلط شعر سن کر پیشانی پر انگرکھے اور کرتے کی آستین والا تناؤ پیدا نہ ہو۔ لکھنو کے نام پر فدا اور لکھنویت کے اپنے نزدیک واحد محافظ یا دیگر محافظوں کے سالار اعظم۔ لکھنو پر کسی طرف سے حملہ ہوا اور آپ نے اپنی فوج کو کوچ کا حکم دیا کہ جاؤ، مٹ جاؤ یا مٹا دو۔ بہادرو، لکھنو سے تم ہو اور تم سے لکھنو۔ لکھنو پر آنچ آئی تو منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔ عام طور پر آپ کو فتح حاصل ہوتی ہے۔

بحیثیت شاعر کے نہایت میٹھے۔ بحیثیت دوست کے نہایت اچھے۔ بحیثیت انسان کے بہت سی خوبیوں کے مالک۔ میدان ادب کے جنگجو۔ شاعری میں نازک خیال کے ساتھ ساتھ نازک مزاج بھی۔ اکثر باہر سے آنے والے آپ سے مل کر واپس چلے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ لکھنو سے مل گئے۔ مگر آج کل یہ لکھنو حیدرآباد میں ہے اور اسی لیے لکھنو سکول کا ادبی شیرازہ کچھ منتشر سا نظر آتا ہے۔

◆◆◆

آغا شاعر

ایک مرتبہ دہلی میں اور دوسری مرتبہ لکھنو میں ملاقات ہوئی ہے۔ دہلی میں مہمان تھا۔ لہٰذا جان بچ گئی تھی۔ لکھنو میں میزبان تھا۔ لہٰذا سر مشاعرہ معتوب ہو کر رہا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا پڑھنے والا نہیں دیکھا۔ ایک طوفان کا منظر۔ ایک زلزلے کا عالم۔ ایک بم کے پھٹنے کی کیفیت مگر بلا کا اثر۔ سننے والے اثر بھی لیں اور سہم بھی جائیں۔ شعر پر جھومنے کو دل بھی چاہے تو بھی دم سادھے بیٹھے رہیں۔ خدا بخشے مرحوم کہتے خوب تھے۔ مشق کے ساتھ ہی ساتھ جدت بھی کافی تھی۔ رسالوں میں کلام پڑھ کر زبانی سننے کا اشتیاق ہوا تھا۔ زبانی سن کر عافیت اسی میں نظر آئی کہ رسالوں ہی میں پڑھ لیا کریں گے۔

خاکسار سے بہت شفقت فرماتے تھے۔ محبت بھرے خط لکھتے تھے۔ مگر انڈسٹریل ایگزی بیشن کے ہندوستان گیر مشاعرے میں جو بگڑے ہیں تو خاکسار سیکرٹری صاحب سلمہٗ اللہ تعالیٰ کو وہ مزہ چکھایا ہے کہ آج تک آواز کی گرج دل ہلائے ہوئے ہے۔

◆◆◆

آغا حشر

مجھے سن یاد نہیں بہر حال میں بہت چھوٹا تھا' جب لکھنو میں میرے مکان کے سامنے ہی میدان میں ایک تھیٹریکل کمپنی نے اپنا منڈوا بنا کر تماشے شروع کیے۔ اس کمپنی کے کرتا دھرتا ایک صاحب تھے جو ریشمی تہبند باندھے دیکھتے کسی اور طرف تھے اور نگاہیں کسی اور طرف ہوتی تھیں۔ کبھی اس کو ڈانٹ کبھی اس کو ڈپٹ۔ گالم گلوچ میں بھی کوئی عذر نہیں۔ مگر خود نہایت پھرتیلے' نہایت محنت اور بظاہر نہایت چلتے ہوئے' معلوم ہوا کہ ان صاحب کا نام ''آغا حشر کاشمیری'' ہے۔ اس وقت تو کہا تھا کہ ہوں گے کوئی! مگر ادبی شعور کے ساتھ ہی ساتھ اس ملاقات کا نقش گہرا ہوتا گیا۔ آخر ۱۹۳۳ء میں کلکتہ جانا ہوا۔ ایک ٹی پارٹی میں خاص طور پر ایک صاحب سے ملایا گیا جو بدستور تہبند باندھے نہایت بے تکلفی کے ساتھ کچھ درویشانہ شان لیے ہوئے تشریف لائے تھے۔ خود ہی فرمایا۔ ''بھئی میں ہوں آغا حشر اور تم ہو شوکت' آؤ ہاتھ ملاؤ اور یہاں سے فارغ ہو کر میرے ساتھ چلو۔'' آغا صاحب کے ساتھ ان کے مستقر پر جا کر کچھ ایسا معلوم ہوا کہ گویا ہم ان سے آج ہی نہیں ملے ہیں مدتوں سے ملتے چلے آئے ہیں۔ شفقت آمیز گالیوں کے ساتھ مفید مشوروں کی دولت اس طرف سے لٹائی جا رہی تھی اور حیرت انگیز سعادت کے ساتھ ہم مالا مال ہو رہے تھے۔ مشوروں سے بھی اور گالیوں سے بھی۔ کلکتہ سے واپس آ کر خط لکھتے تو جواب تک ندارد۔ آخر کار تھوڑے ہی دنوں کے بعد موت نے ہندوستان کا ایک بہترین دماغ ہندوستان سے چھین لیا۔ آغا حشر کو دراصل خود بھی نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کیا تھے۔ اپنے ڈراموں میں بھی وہ اتنے نمایاں نہیں ہیں جتنی دراصل ان میں صلاحیتیں تھیں۔

◆ ◆ ◆

آنند نرائن ملا

اپنے والد کے نام کی سڑک پر لکھنو میں رہتے ہیں اور اپنے لیے ادب میں نئی راہیں نکال رہے ہیں بلکہ نکال چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مجھ سے بہت خلوص سے ملتے ہیں۔ مگر پھر یہ دیکھ کر دل بیٹھ جاتا ہے کہ یہ خصوصیت تنہا میرے ساتھ نہیں بلکہ جس سے بھی ملتے ہیں' خلوص ہی سے ملتے ہیں۔ گویا خلوص عام ہو کر خلوص باقی نہیں رہا ہے۔ عادت بن گیا ہے۔ پیشہ وکالت ہے مشغلہ شاعری اور ذوق ہے برج سے۔ گویا دماغ میں بیک وقت تعزیرات ہند' مصرعہ طرح اور ٹو نو ٹرمپس گڈ مذ رہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ عدالت کو شعر کیوں نہیں سنا بیٹھتے۔ مشاعرے میں شمع اپنے سامنے دیکھ کر ''توبٹ'' کیوں نہیں کہہ دیتے اور تاش کی میز پر بیٹھ کر جرح کیوں نہیں شروع کر دیتے۔

آپ کے ساتھ کبھی تاش کھیلنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ قانونی قابلیت کا اندازہ کرنے کے لیے اپنے اوپر کوئی فوجداری کا مقدمہ چلوانے کی ہمت ہوئی۔ البتہ بحیثیت شاعر کے دیکھا ہے' پڑھا ہے سنا ہے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ شعر میں اگر صرف ترنم ہو تو ڈھول اور شعر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ڈھول میں دونوں طرف سے بجتا ہے اور درمیانی خلا کی طرف کسی کی نظر بھی نہیں جاتی۔ اسی طرح شعر کے جب دو مصرعے مل کر ترنم پیدا کریں تو مشاعرے کے سامعین کو شعر کی گہرائی میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں مگر اس قسم کے ڈھول شعر کا پول کاغذ پر آ کر کھل جاتا ہے۔ جبکہ ترنم گونگا ہوتا ہے اور ناظر گہرائیاں ڈھونڈھتا ہے۔ ملا صاحب کے اشعار میں ترنم بھی کافی ہوتا ہے اور گہرائی بھی کافی۔ حالانکہ وہ خوش گلو نہیں بلکہ بدنام پڑھنے والوں میں سے ہیں۔ جس طرح بچوں کا ایک کھلونا ہوتا ہے جسے کوا کہتے ہیں' چھوٹے سی تاشے میں گھوڑے کی دم کا ایک بال باندھ کر بچے اسے چاروں طرف گھماتے ہیں اور اس میں سے ایک دماغ پاش آواز آتی ہے۔ ''غین غین غین'' ملا صاحب پڑھتے تو اسی طرح ہیں مگر کہتے ہیں ایسا کہ کانوں کے علاوہ دل اور دماغ کی سماعتیں بھی بیدار ہو جاتی ہیں اور مشاعرے کے علاوہ شعر کاغز پر بھی ٹھمری کا کوئی بول نظر نہیں آتا۔ بلکہ شعر ہی رہتا ہے۔ کلام میں عصر جدید کا ٹھوس رجحان نمایاں ہے۔

کشمیری النسل ہیں۔ حسین تو نہیں مگر دل کش ضرور ہیں۔ انگریزی لباس کبھی نہیں پہنا مگر ہندوستانی لباس میں بھی تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں۔ خالی اوقات میں گنگناتے رہتے ہیں اور اپنا کلام سنانے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔ نثر میں بھی روانی ہے اور گفتگو میں بھی سنجیدہ قسم کی بے ساختگی یا کبھی کبھی بے ساختہ قسم کی سنجیدگی!

◆ ◆ ◆

اثر لکھنوی

خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خان اثر ایم بی ای وزیر ریاست کشمیر، ملے تو تھے آپ ایک مشاعرے میں شاعر کی حیثیت سے مگر جب گھر پر ملنے آئے تو والد صاحب مرحوم نے کہا کہ ان کو بھائی صاحب کہا کرو، یہ تمہارے بھائی ہیں یعنی میرے بھتیجے۔ گویا مرکھپ کے ایک دوست ڈھونڈا اس کو بھی قسمت نے بھائی بنا دیا۔

آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

مگر میرے بھائی صاحب اثر، یوسف کے بھائیوں کی طرح نہیں ہیں۔ ڈبونا تو کیا معنی یہ تو مجھ کو اگر ڈوبا ہوا دیکھ لیں تو شاید خود بھی کنوئیں میں پھاند کر اپنی کچھ تازہ غزلیں سنانا شروع کر دیں۔ قوام لگا لگا کر اسی کنوئیں میں پان کھلائیں اور کلام سناتے رہیں گے۔ چائے کا وقت آ جائے تو وہیں سے پکاریں گے ”فیاض!“

بھائی کہتے ہی نہیں سمجھتے بھی ہیں۔ میرا ابھی یہ حال ہے کہ تین بچوں کا باپ ہو چکا ہوں مگر ان کے سامنے سگریٹ پینے کو کسی طرح شراب پینے سے کم نہیں سمجھتا۔ حالانکہ میرے بہت سے دوست ایسے بھی ہیں جو اپنے ذاتی والد کے سامنے نہ صرف سگریٹ پیتے ہیں بلکہ سگریٹ پی کر دھواں والد صاحب کے رخ روشن پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اثر صاحب شاعر اچھے ہیں یا نقاد اچھے اس کا فیصلہ کرنے کا موقع تو جب ملتا کہ میں ان کو کسی حیثیت سے برا سمجھنے پر اپنے کو تیار کر سکتا مگر اس کا موقع کبھی نہ مل سکا۔ میں اگر مصور ہوتا تو شرافت کی تصویر کسی نمائش میں بھیجنے کے لیے اثر صاحب کی تصویر بناتا۔ وہی ان کی شرمیلی شرمیلی سی تصویر۔ بڑھاپے میں اس بلا کی دوشیزگی میرے بھائی صاحب میں ہے کہ قربان ہو جانے کو دل چاہتا ہے۔ باتیں کیجئے تو معلوم ہو کہ نسائی لب ولہجہ میں جو لوچ ہوتا ہے وہ نسائیت کی کوئی ذاتی چیز نہیں ہے۔ نرم نرم الفاظ، میٹھی میٹھی آواز، لوچدار انداز بیان۔ جھکی جھکی آنکھیں اور ان سب پر سفید سفید مونچھیں مگر مجھے تو ان بے موقع مونچھوں پر بھی غصہ نہیں آتا۔ پیار ہی آتا ہے۔

شکل وصورت شریفوں جیسی کسی رذیل سے بات کریں تو وہ بھی شریف ہو جائے۔ جامہ زیب واقع ہوئے ہیں، بنتے نہیں۔ بھاگوانوں کے سر پر بال تو ہوا ہی نہیں کرتے شفاف سا چمکدار سر، تحت اللفظ پڑھتے ہیں شرما شرما کر شیروانی کا دامن مسل مسل کر اور داد کے شور میں اس طرح شرما جاتے ہیں گویا بھری محفل میں غلطی سے کوئی ناگفتہ بہ بات کہہ گئے ہیں اور سلام اس طرح کرتے ہیں گویا معذرت خواہ ہیں۔

◆ ◆ ◆

احسن مارہروی

احسن صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ جب میں ملا تھا اس وقت بھی اچھے خاصے بزرگ ہو چکے تھے مگر سفید بالوں کے باوجود زندگی اور تازگی اس بلا کی تھی کہ مرنے کی خبر سن کر حیرت ہی ہوگئی کہ مولانا احسن آخر کیونکر مر سکتے ہیں اور یہ شگفتہ کپاس کا پھول کیونکر مرجھا سکتا ہے۔ بڑھاپے میں بہت کم لوگ حسین ہوتے ہیں مگر احسن صاحب حسین تھے۔ جب محبت سے مسکراتے اور وفور مسرت سے ہکلاتے تھے تو مخاطب کی آنکھوں میں بھی ان کا خلوص چمکنے لگتا تھا۔ بھوپال کے ایک مشاعرے کے لیے علی گڑھ سے تشریف لا رہے تھے، ادھر لکھنو سے میں چلا تھا۔ جھانسی میں تصادم ہوگیا اور جھانسی سے بھوپال تک پھر کیا مجال جو کسی اور سے باتیں کرنے کا موقع دیا ہو۔ حد یہ ہے کہ اونگھنے تک کی اجازت نہ تھی۔ لطیفے اور چٹکلے، شعر و شاعری کی باتیں، زبان اور محاورات کے مسائل، آخر تھک کر میں نے کہا ”مولانا اب تو اس علمی فضا میں دم گھٹنے لگا۔“ کہنے لگے، اچھا تو اب عشق کرو کسی سے۔ عرض کیا، آپ تو عشق پروف واقع ہوئے ہیں۔ کہنے لگے، تو پھر لڑو مجھ سے۔ میں نے کہا، آئیے دونوں بستر باندھنے کے کمالات دکھائیں۔ کہنے لگے، ہار جاؤ گے۔ چنانچہ واقعی میں ہار گیا۔ بھوپال پہنچ کر ایک شاہی ضیافت میں دیکھتا کیا ہوں کہ مولانا صافہ باندھے کھڑے ہیں۔ میں نے بڑھ کر داد دی کہ خدا کی قسم مولانا شبلی کے استقاء معلوم ہوتے ہیں آپ۔ بے اختیار ہو کر پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور معصومیت سے کہنے لگے ”شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں۔“

زبان اور ادب کے بہت بڑے محقق تھے۔ غلط زبان سن تک نہ سکتے تھے۔ مشاعروں میں ترنم کے سخت مخالف تھے۔ ساغر سے اکثر اس سلسلہ میں نوک جھونک رہتی تھی مگر اب تو اس خلوص سے لڑنے والے بھی میسر نہیں آتے۔

◆◆◆

احسان دانش

ہم وطن نوجوان شاعر احسان دانش؛ جس نے زندگی کے اس مختصر دور میں ان تمام افتادوں کا مقابلہ کر لیا ہے جو ایک اوسط قسم کے بد قسمت انسان کو بڑھاپے تک نصیب ہوا کرتی ہیں۔ احسان نے مزدوری اور مزدور کو اپنی شاعری کا محض موضوع نہیں بنایا ہے بلکہ مزدوری اس شاعر کو خود اپنا موضوع پہلے ہی بنا چکی ہے۔ ٹوکریاں ڈھونے کے بعد اب دوائیں ڈھو رہے ہیں۔ سر پر پہل بوجھ رہا کرتا تھے اب سر تو خالی ہے مگر دماغ میں سودائے سخن۔ آواز اچھی ہے اور ترنم میں کہیں کہیں پر وہ ٹیس نمایاں ہو جاتی ہے جس کو ترقی پسند ادب کا طرۂ امتیاز تسلیم کیا گیا ہے۔

احسان پہلے مزدور تھے اور اب شاعر ہیں۔ سوتے تو خیر اب تک زمین پر ہیں مگر اب لحاف ریشمی ہوتا ہے اور جیب میں گھڑی بھی نظر آتی ہے تا کہ تضیع اوقات کی گواہی دیتی رہے۔ مصائب اس قدر اٹھائے ہیں کہ اب جو راحت نصیب ہوتی ہے تو اس کو بھی مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں۔ معاملات میں دانستہ جھوٹ نہیں بولتے مگر کلام کے مجموعوں میں جو تصاویر شامل ہیں وہ یقیناً جھوٹی ہیں۔ احسان کو دیدہ زیبی سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہاں تک کہ ہزاروں سلام پہنچیں اس خاتون مشرق کو جو احسان کے بچوں کی ماں تک ہے؛ احسان کی رفیقہ حیات ہونا تو درکنار

اے ماؤں بہنو بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے

احسان خوب کہتے ہیں مگر خود ان کو نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کون سی بات خوب کہہ گئے ہیں۔ اپنے کلام میں خوب و زشت کا امتیاز ان کو نہیں ہوتا اور نہ وہ اپنے کلام کے انتخاب کے اہل ہیں۔ جس کسی نے جو ترمیم پیش کر دی۔ آپ قبول کر لیتے ہیں اور اسی طرح اپنی بے شمار نظموں کا ناس مار چکے ہیں۔ خود اپنے شاگرد کو بھی اپنا استاد تسلیم کر لینے میں کبھی نہیں شرماتے۔ اپنے اوپر اعتماد تو بالکل ہے ہی نہیں اگر یہ کمی نہ ہوتی تو احسان آج اپنی موجودہ جگہ سے زیادہ اور کہیں زیادہ بلند نظر آتے۔

◆ ◆ ◆

احتشام حسین

الہ آباد یونیورسٹی کے ایک مشاعرہ میں جانا ہوا۔ الہ آباد میں اویس احمد صاحب ادیب کے یہاں صبح کی چائے ایک سبزہ زار پی رہے تھے کہ ایک نستعلیق ٹائپ کے نوجوان اپنی تجلی طور چمکانے والے دانتوں سے ہنستے ہوئے تشریف لائے اور ایک کرسی پر بیٹھنے والے ہی تھے کہ اویس صاحب نے ’’احتشام صاحب‘‘ کا نعرہ بلند کر کے گرم گرم چائے ان کے پیروں پر گرادی۔ وہ متانت سے کچھ تھوڑا سا اچک کر ایک طرف ہو گئے۔ اویس صاحب نے بجائے معذرت کے فرمایا۔ ’’آپ سے ملے شوکت صاحب تھانوی‘‘ وہ مصافحہ کی نیت سے اپنا ہاتھ لے کر بڑھے اور آخر وہی ہوا جس کو مصافحہ کہتے ہیں۔ یہ تھی احتشام صاحب سے پہلی ملاقات۔ اس کے بعد مشاعروں میں کبھی گورکھپور میں مل گئے کبھی لکھنو میں کبھی اندھیرے میں کبھی اجالے میں۔ یکا یک معلوم ہوا کہ احتشام صاحب نے پڑھنا ختم کر کے پڑھانا شروع کر دیا ہے اور لکھنو یونیورسٹی کے شعبہ اردو فارسی میں لیکچرار ہیں۔ پہلے وہ صرف ادیب تھے اب ترقی پسند ادب کے علمبرداروں میں نظر آتے ہیں۔ لکھنو ریڈیو اسٹیشن پر اکثر ملاقاتیں نصیب ہو جاتی ہیں۔ نیا اور پرانا ادب تھوڑی دیر کے لیے درمیان سے اٹھ جاتا تھا اور بے ادبی کا خلوص دونوں طرف کارفرما نظر آتا تھا۔

احتشام صاحب میں پہلے کافی انفرادیت تھی مگر اب آپ شادی کر بیٹھے ہیں لہذا کچھ قرار واقعی سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر بچوں کی ریل پیل شروع ہو گئی تو نیا اور پرانا دونوں قسم کا ادب رخ زیبا لے کر احتشام کو ڈھونڈے گا۔ اور احتشام کسی گوشہ میں بیک وقت ’’والدین‘‘ بنے ہوئے نظر آئیں گے۔

◆ ◆ ◆

اختر شیرانی

رسائل میں کافی پڑھا ہے۔ یوں بہت کم دیکھا ہے اور جس قدر دیکھا ہے اس سے بھی بہت کم سمجھا ہے۔ البتہ اس بات کی قسم کھائی جا سکتی ہے کہ عالم ہوش میں کبھی نہیں دیکھا۔ میں اپنی حیرت کے نشے میں تھا اور وہ اپنے ذاتی نشے میں' سیراب تشنہ کام۔ میں نے اس بلا کی پیاس کبھی نہیں دیکھی۔ صحرا میں پیاس تو دیکھی ہے مگر دریا کے اندر بھی پیاس؟

اختر شیرانی کے شاعر ہونے پر ایمان ہے۔ پڑھ پڑھ کر جھومے ہیں۔ گنگنائے ہیں مگر اختر شیرانی کو دیکھ کر ایک دھچکا بھی لگا ہے۔ دل چاہا ہے کہ کوئی یہ کہہ دے کہ یہ اختر شیرانی نہیں ہیں اور جب کسی نے کہا ہے کہ یہی ہیں اختر شیرانی تو ایسا معلوم ہوا ہے کہ گویا ہماری ہنسی اڑ رہی ہے' ہم کو طعنہ دیا جا رہا ہے' ہمیں چھیڑا جا رہا ہے۔

◆◆◆

ارشد تھانوی

’’زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا‘‘ کہ میرے نطق نے بجائے میری زبان کے بوسے لینے کے مشورہ یہ دیا کہ ’’ہے ادب شرط منہ نہ کھلواؤ‘‘ اور واقعی بات بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ چھوٹا منہ بڑا بھائی۔ اور بڑا بھی کتنا کہ اگر شادی میں بلا وجہ دیر نہ ہوئی تو اس سعادت آثار بھائی کے برابر خود ان کے برخوردار ہو سکتے تھے۔ ایک دادا کے ہم دونوں پوتے ضرور ہیں مگر عمر میں فرق اتنا ہے کہ ارشد صاحب کو بھائی جان کہتے ہوئے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان کے شایان شان یہ رشتہ نہیں ہے‘ کم سے کم چچا جان تو کہیں۔

آپ اس وقت کے شاعر ہیں جب اس خاکسار کا وجود فطرت کے جوف دماغ میں محدود تخیل تھا۔ ہوش کی آنکھیں کھول کر بھائی جان کو صاحب دیوان شاعر پایا۔ رسالوں میں اپنی نظمیں چھپواتے تھے اور پھر ہم لوگوں کو سنانے کے لیے کسی نہ کسی کو سنا ضرور دیتے تھے۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ ’’بیٹی کو کہیں تا کہ بھوریا کے کان ہوں‘‘ ہمارے خیال میں مقصد ہوتا تھا ہم پہ رعب جمانا چنانچہ رعب جم کر رہتا تھا اور ہم بچپن ہی سے یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے بھائی جان جو ہیں یہ کوئی بڑے آدمی ہیں یعنی اتنے بڑے کہ رسالے والوں نے ان کا نام اور پتہ چھپوا کر رکھ لیا ہے اور ہر مہینے اسی چھپے ہوئے پتے میں لپیٹ لپیٹ کر نہ جانے کون کون سے رسالے اور اخبار اور کتابیں ان کے پاس بھیجتے رہتے ہیں۔

جب شعر سمجھنے کا شعور نہ تھا اس وقت ان کے ترنم سے ڈرا کرتے تھے۔ یعنی ناسمجھی ہی میں یہ سوچا کرتے تھے کہ جس کو گانا نہ آئے‘ وہ آخر گانے کی کوشش ہی کیوں کرے۔ جب شعر سمجھنے کے قابل ہوئے تو ترنم پر اور بھی غصہ آنے لگا کہ آخر اتنے قیمتی اشعار کو اس بھیانک ترنم سے کیوں ذلیل کیا جاتا ہے مگر سمجھاتے کسے۔ آخر صورت یہ نکالی کہ خود بھائی جان کے اشعار ان سے سننے کی بجائے رسائل میں چھپے ہوئے پڑھ لیا کرتے تھے۔ اور جہاں انہوں نے سنانے کے لیے اپنا گلہ کھا کر چشمہ لگایا اور ہم شیروانی کندھے پر ڈال یہ جا اور وہ جا۔

آخر رعب کی بھی حد ہوتی ہے۔ سعادت مندی کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے۔ سوچا کہ اب دوستی پیدا کی جائے ان بزرگ محترم سے۔ مگر اس کی تقریب مہیا کرنا بجائے خود ایک مرحلہ تھا۔ ایک مرتبہ بھائی جان اپنی تمام بزرگی سمیٹ کر بھوپال سے لکھنو تشریف لائے۔ نہایت لیے دیے رہے اور ہم بھی سمٹے سمٹائے سوکھے سہمے بنے رہے جب آپ واپس جانے کے لیے لکھنو اسٹیشن پر تشریف لا کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے اور ہم ازراہ سعادت برتھ پر بستر لگانے چلے آئے تو یکایک دوستی کی تقریب سوجھ گئی قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک مسافر سے پوچھا۔

’’آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟‘‘

’’بھیلسہ‘‘

’’بہت ہی اچھا ہوا، اب مجھے پورا اطمینان ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ یہ صاحب جو جا رہے ہیں جن کا میں بستر بچھا رہا ہوں۔ یوں تو خیر اب اچھے ہیں علاج سے بہت فائدہ ہوا ہے مگر آپ پھر راستہ میں ذرا خیال رکھئے گا۔ ایک تو کھڑکی کی طرف نہ آنے دیجئے گا دوسرے ذرا منہ ہٹا کر بات کیجئے گا شاید حملہ کر بیٹھیں۔‘‘

’’کیا مطلب، یعنی کچھ......‘‘

’’جی ہاں، دماغ بالکل خراب ہو گیا تھا۔ مگر اب بہت فائدہ ہے۔ پھر بھی احتیاط شرط ہے۔‘‘

ٹرین روانہ ہو گئی۔ وہ بھوپال چلے گئے اور ہم گھر آ گئے۔ بھول بھی گئے کہ کیا ہوا تھا۔ پانچویں روز والد صاحب کے نام ایک لمبا چوڑا خط آیا۔ وہ پڑھتے جاتے تھے اور ہنستے جاتے تھے آخر وہ خط ہم کو دیا گیا کہ ملاحظہ فرمائیے اپنے کرتوت۔ خط میں پوری تفصیل ایک افسانہ کی صورت میں درج تھی کہ کیونکر اس مسافر نے آپ کو اور آپ نے اس کو پاگل سمجھا۔ یہاں تک کہ جب کانپور کے قریب آپ گنگا کا نظارہ کرنے کے لیے کھڑکی کی طرف بڑھے تو اس مسافر نے اس بری طرح ڈانٹا ہے کہ بھائی جان کی طبیعت ہی خوش ہو گئی۔ مگر صبح ہونے پر جب اس مسافر نے صحیح الدماغی کا پورا یقین کر لیا تو سارا قصہ سنا دیا کہ کس طرح آپ کے برادر عزیز نے یہ گل کھلایا تھا۔ دوستی تو خیر یہیں سے ہو گئی تھی۔ مگر اس کے بعد متعدد مرتبہ شرارتوں کی ضرورت بے تکلفی پیدا کرنے کے لیے پیش آئی اور الحمدللہ کہ اب بھائی جان صرف بڑے بھائی نہیں بلکہ بے تکلف دوست بھی۔ پہلے شعر کہتے تھے اب بچے فرماتے ہیں۔ صاحب دیوان بننے کا ذوق صاحب اولاد بننے کے ذوق کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ بھوپال میں صرف وکالت ہی نہیں فرماتے ہیں مردم شماری میں اضافہ بھی آپ ہی کے سپرد ہے۔ مگر اپنی تمام اولادوں سے زیادہ محبت اسی ’’عزیزم سلمہ‘‘ سے ہے۔ میاں اور بیوی میں باہم اس قدر اعتماد ہے کہ وہ پابندی کے ساتھ شیو کرنا ضروری نہیں سمجھتے اور وہ کنگھی چوٹی کے جھمیلوں میں وقت برباد نہیں کرتیں۔ دونوں ایک دوسرے کے دکھ سہہ لیتے ہیں، لڑ لیتے ہیں۔ وہ ان کے لیے کھانا پکا دیتی ہیں اور وہ ان کے لیے چائے بنا دیتے ہیں۔ دولت نہیں ہے مگر قلندرانہ زندگی مزے میں گزر رہی ہے۔

آج کل شاعری میں سیاست کو بہت دخل ہے۔ قومی نظمیں فرماتے ہیں۔ مشاعروں کے شاعر نہ پہلے تھے نہ اب ہیں۔ بلکہ اگر کبھی مشاعرے میں شعر خوانی کی مصیبت نازل ہی ہو گئی ہے تو پھانسی کے تختے پر جانے والی ادا کے ساتھ ڈائس پر تشریف لے گئے ہیں۔ اور غزل اس طرح تحت اللفظ ارشاد فرمائی ہے گویا مسجد شہید گنج کے متعلق تقریر بھی کر رہے ہیں اور کرپان سے ڈر بھی رہے ہیں۔

کتب بینی کا بے حد ذوق ہے۔ کتاب پڑھتے پڑھتے ایک دم بستر سے اچھل کر باورچی خانے میں پہنچ جاتے ہیں اور بیگم کے سر پر سوار کہ ’’سنو بیگم، لاحول ولا قوۃ ذرا سن تو لو۔ کس قدر لاجواب بات ظالم نے لکھ دی ہے۔ پتیلی چھن من کر رہی ہے آپ بیگم کو سنا رہے ہیں کتاب اور وہ فرما رہی ہیں خلال، کہ یکا یک کوئی بچہ بھداک سے گرا کیچڑ میں پھسل کر اور اسی بہانے یہ تمام ادب نوازی ملتوی ہو گئی۔

اخبار کے انتظار میں چشمہ لگائے لوٹا بھرے ککلہ کھائے بیٹھے رہتے ہیں یا دفع الوقتی کے لیے ٹہل مارتے پھرتے ہیں جہاں اخبار آیا' لوٹا سنبھالا' اخبار لیا اور تیر کی طرح غسل خانے میں جا پہنچے۔ اگر خدانخواستہ کسی پریس ایکٹ کے تحت یہ تمام اخبار بند کر دیے جائیں تو معلوم نہیں ہمارے بھائی جان بیچارے کا قبض کے مارے کیا حال ہو۔

◆◆◆

ایم اسلم

سر پنچ کی ادارت کے زمانے میں میاں ایم اسلم سے خط و کتابت کی تھی۔ یہ خط و کتابت اس وقت کام آئی جب پہلی مرتبہ لاہور آنے کا اتفاق ہوا۔ آپ ہی کے یہاں قیام کیا۔ لاہور کی مچھلی اور لکھنو کے آم دونوں آپ کے یہاں بیک وقت میسر تھے اور ہاں بات بات پر سکنجبین۔

میں میاں ایم اسلم کی مزاح نگاری کو ان کی زبردستی اور افسانہ نگاری کو ان کا آرٹ سمجھا کرتا تھا جب ملا تو اندازہ ہوا کہ ایسا غمزدہ انسان جس کو حادثات نے بجھا دیا ہو اگر مزاح نگار ہو سکتا ہے تو محض انتقاماً...... فطرت سے انتقام لینے کے لیے۔ ورنہ وہ تو خود سراپا ٹریجڈی واقع ہوئے ہیں۔ ان کو اپنی منہ بولی بچی اصغری کی وفات کا جو صدمہ ہے اس نے زندگی ہی کو ایک مستقل ماتم بنا دیا ہے۔

ٹائی باندھتے ہیں مگر پتلون کبھی نہیں پہنا۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق تصانیف سے ظاہر ہے مگر شکار کی دلچسپی کا اندازہ کرنے کے لیے بندوق شریف کی زیارت ضروری ہے افسانے لکھتے ہیں اور گولیاں چلاتے ہیں اس کے علاوہ نہ کوئی دلچسپی نہ کوئی مشغلہ اپنی آزادی کے خود ہی گرفتار ہیں صاحب اولاد نہیں البتہ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ تصنیف مصنف کی اولاد ہوتی ہے اس اعتبار سے اسلم صاحب بھی درجنوں بچوں کے باپ ہیں۔ افسانہ نگاری اور ناول نگاری دونوں آپ کے کھیت کی مولیاں ہیں۔

◆ ◆ ◆

اصطفا خاں

عجیب متضاد شخصیت۔ عطر کی تجارت اور شاعری کا ذوق داڑھی اور پٹے اور اسکیٹنگ میں اپنی آپ نظیر۔ نماز اور روزہ، بلیرڈ اور پینٹنگ۔ حج بھی خدا جانے کتنے کر چکے ہیں اور لندن بھی نہ جانے کتنی مرتبہ ہو ہو رجوں کے توں واپس آ گئے ہیں۔ ادبی ذوق میں بھی تجارت کو دخل ہے کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی کا اشتہار ادبی رسائل میں چھپ رہا ہے اور اصطفا خاں صاحب کا ادبی ذوق بھی سیراب ہو رہا ہے۔ تجارت تحت اللفظ فرماتے ہیں۔ اور شعر ترنم سے پڑھتے ہیں۔ داڑھی اور شاعری کے معاملہ میں اپنی اولاد کے جھرمٹ میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ امتیاز دشوار ہو جائے۔ سب بچوں کے والد نما داڑھیاں اور خود بچوں کی طرح شعر خوانی کے لیے موجود۔

گھر کئی مرتبہ ویران ہوا مگر ہر ویرانی کے بعد جب آنکھ کھلی تو گھر کی طرف یہی کہتے ہوئے دوڑے کہ واہ...... ’’ہم بیابان میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے‘‘

عمر ایک معمہ ہے۔ اپنے بچپن سے اس تقریباً بڑھاپے تک خان صاحب کو ایک ہی رنگ میں دیکھا۔ گویا عمر ایک جگہ پر ٹھہر گئی ہے۔ حد یہ ہے کہ خود آپ کے بچے بڑھ بڑھ کر آپ کے برابر نظر آنے لگے مگر آپ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آپ کو اپنے کارخانہ کے عطر حنا پر ناز ہے۔ حالانکہ ہونا چاہیے اپنے اس شعر پر ناز

خدا کسی کو کبھی صاحب غرض نہ کرے
سخی ہے کون یہ دست سوال کیا جانے

معلوم نہیں آپ سے یہ شعر کس ضرورت نے کہلوا دیا تھا۔ گرمیوں میں منصوری اور جاڑے میں لکھنو میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ان دونوں جگہ نہ ہوں تو مدینہ منورہ یا پیرس میں احتیاطاً ڈھونڈ لیجیے۔

◆◆◆

اصغر گونڈوی

روزنامہ ”ہمدم“ میں عملہ ادارت کے ایک رکن قاضی محمد حامد صاحب حسرت بھی تھے۔ آدمی با اخلاق تھے۔ یعنی اکثر دعوتیں کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے یہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ روشن، روشن، صاف صاف، نکھرے نکھرے سے ادھیڑ عمر کے وجیہہ آدمی، خوبصورت فرنچ کٹ داڑھی، سر پر پٹے، ہنستی ہوئی آنکھیں اور دل کی سچائی چہرہ پر متبسم معلوم ہوا کہ آپ ہیں اصغر گونڈوی۔ اصغر تک تو خیر غنیمت تھا۔ مگر یہ گونڈوی اور بہیلوی کیا بلا ہے۔ ایسے سنجیدہ آدمی کے نام کا ایک جزو گونڈوی کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اپنی شاعری کا ذکر تک نہیں کیا۔ میرے مزاحیہ مضامین کے تذکرے شروع کر دیئے۔ رشید احمد صاحب صدیقی کا ذکر بار بار محبت سے کرتے تھے اور گریز ہوتا تھا میری طرف۔ بہرحال اس پہلی ملاقات میں بقول اصغر کے...... ”اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا“

دوسری مرتبہ گورکھ پور کے ایک مشاعرے میں مل گئے۔ بڑی خصوصیت سے ملے۔ ان سے مل کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گرمیوں میں برف کا پانی پی رہے ہیں۔ یا جاڑے میں تاپ رہے ہیں۔ مشاعرے کا دور، آپ ہی پر آ کر ختم ہوا مگر آپ جو ڈائس پر تشریف لے گئے تو اب آواز نہیں نکلتی۔ شرما رہے ہیں۔ بیٹھے ہوئے بیزار ہیں اپنی شاعری اور اس مشاعرے کی شرکت سے اور رحم طلب نظروں سے دیکھ رہے ہیں میری طرف۔ میں بڑھ کر ڈائس پر آ گیا۔ غزل ہاتھ سے لے کر پڑھنا شروع کر دی۔ اور ان کی جان میں جان آئی۔ تیسری مرتبہ لکھنو کی ایک سڑک پر مل گئے۔ کہنے لگے چلو میڈیکل کالج۔ میں نے کہا، خیریت؟ کہنے لگے، رشید بیمار ہیں، لیے ہوئے رشید صاحب صدیقی کے پاس میڈیکل کالج پہنچے۔ ان سے تمام باتیں کیں۔ مگر بیماری کے متعلق ایک بات بھی نہ کہی نہ مزاج پوچھا نہ دعا دی۔ ہنس بول کر چل آئے۔ الہ آباد میں ملے تو ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کس طرح بچھ جائیں۔ تکلف کرتے تھے مگر تکلف کی طرح نہیں۔ محبت کرتے تھے مگر چاہتے تھے کہ اس پر محبت کا گمان نہ ہو۔

شاعری پیشے کے طور پر نہیں تھی اور نہ شاعر کی حیثیت سے کبھی کوئی شعر کہا بلکہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ جس شعر کے اعمال خداوند کریم کے نزدیک صالح ہوتے ہیں اس کو اصغر سے کہلوا دیتا ہے۔ تمام نشاط روح اسی قسم کے خوش اعمال اشعار کی جنت ہے۔

◆◆◆

اعجاز حسین

سید اعجاز حسین، الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر اور مختصر تاریخ ادب اردو کے مورخ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اچھے خاصے مرد آدمی ہوں گے مگر باتیں سنئے تو بھولی بھولی۔ صورت دیکھئے تو معصوم سی دل کا حال خدا جانے یا ڈاکٹر حفیظ سید۔

ہمیشہ محبت سے ملے اور تکلف کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر ہمیشہ کترا گئے۔ شعر کہتے ہیں، خوب کہتے ہیں مگر بہت اور شاید کبھی کبھی جب غصہ اتارنے کو کوئی نہیں ملتا ہے تو شاعری پر غصہ اتارا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک غزل ہو جاتی ہے پڑھتے کبھی نہیں سنا اور صورت سے اندازہ بھی یہی ہوتا ہے کہ آپ کا پڑھنا نہ سن کر ہم کسی نقصان میں نہیں رہے ہیں۔

◆◆◆

افسر میرٹھی

حامد اللہ افسر میرٹھی....... بچپن سے آپ کی نظمیں پڑھ رہے ہیں مگر اب بھی آپ ہمارے برابر ہی نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ لوگ تھرماس میں بیٹھ کر اپنی عمر کو ایک جگہ قائم رکھتے ہیں یا مصری ممی پر لگانے والا مسالہ کہیں سے ہاتھ آ گیا ہے۔

افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ پروفیسر بھی ہیں اور ممتحن بھی۔ عقد ثانی سے قبل آپ کے کچھ دوست بھی پائے جاتے تھے مگر اس عقد مکرر کے بعد سے تو یہ حال ہے کہ....... ''فارغ ز خزانے و ہم از باغ و بہارے''

بے بی آسٹن کی طرح کا منا سا قد۔ بات بات پر کھوکھلی ہنسی جو زبردستی اپنے کو خوش اخلاق ثابت کرنے کے لیے لوگ ہنسا کرتے ہیں۔ دن رات بس یہی فکر کہ اور کس طرف سے روپیہ سمیٹا جائے گھر میں دن رات ریڈیو اپنی پوری آواز کے ساتھ کھلا رہتا ہے تا کہ گھریلو باتیں نشر ہونے سے بچ جائیں اور یہ آواز ان کو دبا لے۔

صاحب اولاد نہیں ہیں مگر اس کی چنداں فکر بھی نہیں ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ دوسری شادی اسی غرض سے کی گئی ہے مگر ہم کسی کی غرض پر حملہ کیوں کریں۔ شادی کے لیے اولاد کے علاوہ اور اغراض بھی ممکن ہے۔ ہر وقت کسی ادبی مصروفیت کا اظہار ہوا کرتا ہے حالانکہ اب ادبی مصروفیت کے لیے آپ فارغ ہی کب ہیں۔

◆◆◆

افقر موہانی

”آفاقہا گردیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری“

◆◆◆

اقبال

لاہور آنے کا شوق سب سے زیادہ اس لیے تھا کہ سر محمد اقبال سے ملیں گے۔ چنانچہ ملے۔ شاعر اعظم انتہائی سادگی کے ساتھ ایک مونڈھے پر بیٹھے ہوئے حقے سے شغل فرما رہے تھے اور لکھنو کے ایک مجذوب نوجوان شاعر مجازی صاحب آپ کے پاس بیٹھے تھے۔ تعارف کے بعد لکھنو اور لاہور کا ذکر چھڑا ہی تھا کہ مجازی صاحب نے کہا۔

''میرا مطلب یہ ڈاکٹر صاحب کہ اگر آپ کی زبان بھی درست ہوتی تو.......''

ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ ''تو سبحان اللہ''

مجازی صاحب نے کہا۔ ''یہی نہیں بلکہ ایک بات ہوتی۔''

ڈاکٹر صاحب نے میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ ''مجازی صاحب میرے حال پر ترس کھا کر لاہور تشریف لے آئے ہیں تا کہ میری زبان درست فرماتے رہیں میں اب آپ ہی سے مشورہ لوں گا۔''

مجازی صاحب اس طرح متانت سے بیٹھے رہے گویا ڈاکٹر صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ درست ہے۔

میں نے عرض کیا۔ ''ڈاکٹر صاحب یہ خدا کو ہی نہیں مانتے۔ آپ تو پھر بھی خدا کے بندے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''اسی لیے تو میں خوش ہوں کہ یہ مجھے بھی نہیں مانتے۔ یہ ایک طرف ہیں اور میں اور میرا خدا ایک طرف۔''

مجازی صاحب نے تمسخر سے فرمایا۔ ''ہونہہ 'خدا.......''

ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر کہا۔ ''زیادہ حد ادب''

اس کے بعد مجازی صاحب تو اپنے ناخنوں سے میل نکالتے رہے اور یہاں گفتگو نہ جانے کہاں کہاں ہوتی ہوئی رفیع احمد خان صاحب تک پہنچ گئی۔ جن کا ایک شعر میں نے ڈاکٹر صاحب کو سنایا تھا۔ رفیع احمد خان صاحب عریاں کہتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اصرار کر کے ان کے بہت سے شعر سنے اور کہنے لگے کہ خیریت ہے کہ یہ صاحب اس رنگ میں کہتے ہیں ورنہ بڑے بڑوں کا پتہ نہ چلتا کہ کدھر گئے۔ اس رنگ کے خود بھی اکثر شعر سنائے۔

ان کی زبان درست تھی یا نہیں' وہ حقہ کہتے یا حکہ مگر یہ واقعہ ہے۔ ان سے ملنے کے بعد ان کی وہ عظمت جو کتابوں سے حاصل ہوئی تھی میرے دل میں دوگنی ہو گئی۔ لکھنو جا کر اپنی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ گہرستان میں نے بھیجا۔ اس کو پڑھ کر جو خط مجھے لکھا ہے۔ اس سے عظیم

المرتبت شخصیت کی رفعتوں کا اندازہ ہوتا ہے پھر کچھ دن خط وکتابت رہی مگر افسوس کہ ان کا وقت آچکا تھا اور میں نے ملنے میں بہت دیر کی تھی۔ پھر دوبارہ نہ مل سکا۔

◆◆◆

اکبر حیدری

پہلی مرتبہ جب علی گڑھ یونیورسٹی کی جوبلی میں ملاقات ہوئی تو میں سمجھا تھا کہ کسی رجواڑے کے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں یا کہیں تھانے دار ہوں گے۔ مونچھوں پر وہی نیبو رکھ لینے والا تاؤ‘ باتیں ذرا تیز اور دبنگ قسم کی‘ تیور سپاہیانہ‘ پتہ چلا کہ آپ تو شاعر ہیں اکبر حیدری۔ میں نے کہا‘ اللہ اکبر علی گڑھ میں کچھ بدمزگی سی رہی۔ سیماب صاحب اور اکبر حیدری صاحب میں ذرا تیز قسم کا تبادلہ خیال ہو گیا تھا۔ دوسری مرتبہ دہلی میں ملا۔ خود ان ہی کے گھر پر بلکہ ان کے گھر پر دعوت میں۔ حکیم یوسف حسن نیرنگ والے۔ عشرت رحمانی جو اس وقت ’’نیرنگ خیال‘‘ کے ایڈیٹر تھے۔ نسیم انہونوی‘ سرپنچ والے سب جمع تھے۔ معلوم نہیں کس طرح حکیم یوسف حسن صاحب اور نسیم انہونوی صاحب میں یوپی اور پنجاب کی بحث چھڑ گئی۔ دونوں میں تیز بحث ہونے لگی جس کو نسیم صاحب لڑائی سمجھ رہے تھے اور یوسف حسن صاحب مذاق۔ اکبر حیدری مرحوم دونوں کو سمجھا رہے تھے۔ کبھی اپنا میکہ پنجاب کو بتاتے تھے اور کبھی اپنی سسرال یوپی کو عشرت اور شوکت دونوں خاموش تماشائی تھے اس لیے کھانا مزیدار تھا۔

اکبر حیدری بہت اچھے دوست بڑے منہ پھٹ نقاد بڑے زود گو شاعر اور بڑے جنگجو ادیب تھے۔ شلوار پہن کر قاف اس صفائی سے کہتے تھے کہ شلوار جھوٹی نظر آنے لگتی تھی۔ گوروں کو اردو پڑھاتے ت ھے اور اس مشغلہ سے اس قدر مطمئن تھے گویا ہفت اقلیم کی شہنشاہی حاصل ہے۔ عشرت رحمانی سے بہت خصوصیت برتتے تھے اور عشرت بھی حاضر غائب ہمیشہ ان کا مداح تھا۔

◆ ◆ ◆

امید امیٹھوی

ابوالکمال امید امیٹھوی، جلال لکھنوی کے شاگرد اور بہت سے منحرف اور معترف شاگردوں کے استاد ضعیف العمر، غمزدہ اور پامال قسم کے انسان ہیں۔ پہلے تھانیدار رہتے تھے، اب سخن ور ہیں۔ کلام استادانہ ہوتا ہے فن کے ماہر ہیں مگر گفتگو کریں تو سمجھ میں نہ آئے۔ شعر خواہ کسی بحر کا ہو پڑھتے مثنوی کے انداز سے ہیں۔ لے سمجھ میں آجاتی ہے الفاظ سمجھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی گفتگو سمجھ لیتا ہے تو اس کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر شفقت میں ڈوبے ہوئے الفاظ فرما رہے ہیں ورنہ عام طور پر گفتگو صرف یہ سمجھ میں آتی ہے کہ گویا لوٹا بھق بھق کر کے کسی حوض میں ڈوب رہا ہے۔

◆◆◆

امین سلونوی

میرے سب سے پہلے ادبی دوست ہیں اور حیرت ہے کہ ہم دونوں اس قدر سخت جان نکلے کہ زندہ بھی ہیں اور ایک دوسرے دشمن بھی نہیں بنے۔ جتنے پرانے ہم دونوں دوست ہیں اتنے پرانے تو دشمن بھی نہیں ملا کرتے۔

آپ رسالہ نظر لکھنو کے ایڈیٹر تھے اور ہم مضمون نگار اسی زمانے میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ اس حادثہ کو اٹھارہ انیس برس ہو چکے ہیں۔ امین صاحب اس زمانہ میں غازی بننے کے شوق میں مبتلا تھے یعنی انور بے کی طرح مونچھیں چہرہ پر مائل پرواز نظر آتی تھیں۔ الہ دین کے موکل دیو کے سر پر اسی قسم کے سینگ کی قلمی تصویر میں آپ نے دیکھے ہوں گے۔ آپ تو معلوم نہیں غازی بن سکے یا نہیں البتہ مونچھیں شہید ہو گئیں۔ رسالہ نظر بند ہوا۔ امین صاحب نہ معلوم کہاں کہاں اور کس کس منزل سے گزر کر روزنامہ اودھ اخبار کے عملہ ادارت میں جا پہنچے مگر یہ ملازمت تو محض شگون کے طور پر گویا جینے کے لیے کر رکھی ہے۔ ورنہ آپ کا اصلی کام ہے خود اپنی خبر رساں ایجنسی کو چلانا جو انڈی پنڈنٹ نیوز سروس کے نام سے لکھنو میں قائم ہے اور یہ قیامت کا وارفتہ انسان کولہو کے بیل کی سی مشقت کرنے کے بعد اس خبر رساں ایجنسی کو کامیابی کے ساتھ چلا رہا ہے۔ صورتاً بڑے شریف زادے نظر آتے ہیں۔ مگر اس سنجیدگی کے پردے میں جو شوخیاں تڑپا کرتی ہیں۔ ان کو کچھ وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو امین صاحب کے ساتھ کبھی ہم سفر ہو چکے ہیں یا کم سے کم مشاعرے میں آپ کے ہمراہ شریک ہوئے ہیں۔ مشاعرے میں جس سنجیدگی سے آپ مہمل اشعار کی داد دیتے ہیں۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ کسی شاعر نے کوئی مہمل شعر پڑھا۔ تمام مشاعرہ خاموش رہا۔ صرف امین صاحب جھوم جھوم کر چیخ رہے ہیں۔ ’’ہائے ہائے پھر فرمائیے جناب پھر فرمائیے‘ آپ نے صنعت تداخل فصلیں پیش کی ہیں۔‘‘ شاعر سلام کر رہا ہے اور مہمل شعر بار بار پڑھے جاتا ہے۔ اب کیا مجال کہ امین صاحب کو کوئی خاموش کر دے جس کسی نے اشارے سے منع کیا۔ امین صاحب نے اسی کی طرف شاعر کو متوجہ کر دیا کہ دیکھئے آپ بھی داد دے رہے ہیں حضرت یہ تو انتقائے جزر ہے شعر کا نفس مقیاس السعود بنا جا رہا ہے۔ شاعر اس قاموسے کا لوہا بھی مان رہا ہے اور سلام بھی کر رہا ہے۔ اس قسم کے منظر ہو اس مشاعرے میں آپ کو مل جائیں گے۔ جس میں امین صاحب کے قدم پہنچ گئے ہیں۔ انتظامی قابلیت بلا کی ہے جو کام آپ حشر پر ملتوی کرانا چاہتے ہوں۔ امین صاحب کے سپرد کر دیجئے۔ ہمیشہ آپ کو مطمئن رکھیں گے اور کام بھی نہ ہو سکے گا۔ رفاہ عام کے کاموں سے بے حد دلچسپی ہے مثلاً شیروانی اس لیے بنواتے ہیں کہ آپ کے انتخاب سے دوسرے فائدہ اٹھائیں۔ ایک ایک کو دکھاتے پھریں گے کہ دیکھو کس قدر ارزاں کتنا دیدہ زیب اور کیسا مضبوط کپڑا ہے پھر یہ کہ سکڑتا تو ایسا ہے کہ نیا تم پہنو اور دھل کر آئے تو تمہاری اولاد کے کام آ سکتا ہے۔ اس کے بعد

دوسری دھلائی میں بھی بیکار نہیں ہوتا۔ ننھی کا گڈا پہن سکتا ہے۔

خوبیاں یوں تو بہت ہوں گی جو انتہائی یگانگت کی وجہ سے اس گھر کی مرغی میں نظر نہیں آتیں مگر کفایت شعار ضرور ہیں اور یہ خوبی دوستوں کو عیب کی حد تک نظر آتی ہے۔ لکھنا اور پڑھنا تو خیر جانتے ہی نہیں۔ اس کے علاوہ کھانا پکانا۔ کپڑے دھونا اچار اور مربے تیار کرنا وغیرہ بھی جانتے ہیں مگر اس بے تکلفی کے باوجود آج تک یہ نہیں بتایا ہے کہ جعلی نوٹ بنانا بھی جانتے ہیں یا نہیں۔

◆◆◆

انیس احمد عباسی

لکھنو کے روزنامہ حقیقت کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ میونسپل کمشنر بھی ہیں اور لکھنو میں اچھی خاصی ذمہ دارانہ حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں یا شاید زندگی آپ کو بسر کر رہی ہے۔

پرانے لکھاڑ ہیں، جب جی چاہتا ہے نہایت دبنگ قسم کے ایڈیٹر بن جاتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی مقالات افتتاحیہ سے ''میاؤں'' کی آواز بھی آ جاتی ہے۔ مجبوری کی بات دوسری ہے، ورنہ فطرتاً ان کی رائے نہایت بے لاگ اور آزاد ہوا کرتی ہے۔ صحافت کے تمام داؤ پیچ جانتے ہیں۔ سید جالب ایسے ''بابائے صحافت'' کے محبوب شاگرد رہ چکے ہیں اور کبھی کبھی آپ کی تحریر میں استاد مرحوم کا رنگ پھوٹ نکلتا ہے۔ مدت سے روزنامہ حقیقت کو بغیر کسی کسی سہارے کے قطعاً توکل پر چلا رہے ہیں۔ آج اخبار نکل جاتا ہے اور کل کی کبھی فکر نہیں ہوتی مگر اس بے سروسامانی کے باوجود آپ کو تھالی کا بینگن بنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ سادگی اور وضع داری، یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے قائل آپ کے مخالفین بھی ہوں گے۔ گریجویٹ ہیں مگر سادگی کے بدولت مڈل پاس بھی مشکل ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ ترکی ٹوپی اور کبھی کبھی گاندھی کیپ بہرحال جو ٹوپی بھی ہو سر پر منڈھ کر رہ جاتی ہے پھر کیا مجال کہ سر سے کبھی اتر جائے۔ جاڑے میں اسی ٹوپی پر ایک گلوبند باندھ لیا جاتا ہے۔ چھڑی کا سہارا لے کر میلوں کا سفر کر جاتے ہیں۔ دفتر آئے، گھر گئے، سسرال ہو آئے۔ پارٹیوں میں شرکت کی بورڈ کی میٹنگ میں حاضری دی اور سب جگہ ہوتے ہواتے اسی چھڑی کے سہارے رات کو دس بجے گھڑی کی سوئی کے تھا خان بہادر شیخ احمد عرف ڈلن صاحب کے یہاں موجود ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں، ہنس بول رہے ہیں۔ دوسروں کے دکھ سن رہے ہیں اپنا دکھ کسی کو نہیں سناتے۔

صورت سے یتیم نظر آتے ہیں مگر چپکے چپکے سینکڑوں یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ کوئی ضرورت مند آپ کے پاس پہنچ جائے تو اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم سمجھیں گے پھر خود چاہے ڈنڈے بجاتے پھریں مگر خوش ہوتے ہیں کہ ضرورت مند کی ضرورت پوری ہو گئی۔ کئی بار کہا کہ انیس بھائی یا تو فقیری لے لیجیے یا انسانوں کی صورت بنایئے کہتے ہیں کہ تم مزاح نگار ہو مذاق کر رہے ہو، کاش کوئی سنجیدگی سے انیس بھائی کو سمجھا دیتا۔

◆◆◆

انصار ناصری

سید انصار علی ناصری۔ رسالہ ”ساقی“ دہلی کے دفتر میں سب سے پہلے ملاقات ہوئی۔ افسانے اور مضامین اس سے بھی پہلے دیکھ چکے تھے ملے تو ان کو اپنے سے بھی کم عمر اور اپنے سے کچھ زیادہ مہذب پایا۔ پھر ہر مرتبہ دہلی کے سفر میں ملاقات ہوتی رہی۔ کبھی سر راہے کبھی ریڈیو اسٹیشن پر کبھی شاہد صاحب کے یہاں مگر یہ ملاقاتیں یوں ہی آداب عرض تسلیمات عرض۔ مزاج تو اچھا رہا۔ آپ کی دعا ہے۔ بھئی وہ مضمون خوب تھا‘ قسم کی رسمی ملاقاتیں تھیں۔

لکھنو ریڈیو اسٹیشن پر ہم تو خیر تھے ہی یکا یک دیکھتے کیا ہیں کہ آپ بھی بسلسلہ ملازمت چلے آ رہے ہیں۔ پھر کیا تھا تقریباً تین چار سال دن رات کا ساتھ رہا۔ ساتھ ساتھ ناچے ساتھ ساتھ گائے۔ لڑے جھگڑے۔ روٹھے منے۔ دھول دھپا۔ ہاہا ہوہو

انصار پہلے کافی لکھتے تھے۔ ریڈیو میں کیا آئے اپنے ادب کے قبرستان میں آ گئے پھر قسم کھانے کو بھی کچھ نہ لکھا۔ البتہ ایک اچھے پروڈیوسر بن گئے۔ ڈرامہ آپ کی خاص لائن ہے اور ڈائرکشن عبادت کے سے انہماک کے ساتھ فرماتے ہیں۔ الفاظ کے مدوجزر کے ساتھ آپ کے جسم میں بھی جوار بھاٹے کی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ پس منظر موسیقی کے ساتھ غیر ارادی طور پر تھرک رہے ہیں غیر محسوس طور پر ناچ رہے ہیں۔ پیشکش کامیاب رہی تو قلا بازیاں کھا رہے ہیں تمام اداکاروں پر سے صدقے ہوئے جاتے ہیں۔ ناکام رہی تو پیشانی پر رہ رہ کر ہاتھ مارتے ہیں اور ایسا گہرا اثر لیتے ہیں گویا کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔

ایک اچھے ادیب تھے مگر بہت اچھے پروڈیوسر بن گئے ہیں۔ ریڈیو کے لیے موزوں ترین شخصیت ہیں۔ اپنے کو ماحول کے مطابق ڈھال لینے میں کمال حاصل ہے۔ ان تمام خوبیوں میں ایک برائی بھی ہے کہ خلوص پر اعتماد نہیں کرتے۔ چوکنا رہتے ہیں۔ اس خوبصورت ہرن کو اپنے باغ میں ہر طرف شکاری نظر آتے ہیں معلوم نہیں یہ وحشت کیوں ہے۔

◆ ◆ ◆

اویس احمد ادیب

نسیم صاحب انہونوی کی معرفت ہمارے دوست ہیں۔ پہلے الہ آباد یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اب حلیم انٹر کالج کانپور میں پروفیسر ہیں۔ ایم اے ہیں' بی اے آنرز ہیں' منشی فاضل ہیں اور نہ معلوم کیا کیا ہیں البتہ تخلص ''ادیب'' یونہی برکت کے لیے ہے شعر نہیں کہتے یہ دوسری بات ہے کہ نثر ہی میں کبھی مقطع کہنے کی ضرورت پیش آتی ہو۔ اس کے علاوہ تو تخلص کی اور کوئی وجہ سمجھ میں آتی نہیں۔

پاکٹ سائز کے واجبی سے آدمی ہیں۔ قدرت نے آپ کو اس سرحد پر مرد بنایا ہے کہ اگر ذرا ہاتھ بہک جاتا تو عورت ہو جاتے پھر بھی بہت سی ادائیں دلستان ہیں۔ ہر چند کہ شادی شدہ ہیں۔ صاحب اولاد ہیں مگر ایک اچھوتا پن اب تک پایا جاتا ہے۔ شرمیلے ہیں نگاہوں میں عفت کی چمک پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی ذرا تیز اور کھلی ہوئی بات آپ سے کہہ دی جائے تو فوراً اپنے تیوروں سے کچھ جھینپ کر یہی کہتے ہیں کہ.......

''ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں''

یہ معلوم کیا کیا لکھتے رہتے ہیں۔ فلموں پر اور فلم اسٹارز پر چند کتابیں لکھ چکے ہیں۔ افسانے بھی لکھتے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی۔ تحریر میں شگفتگی اور روانی دونوں ہیں مگر عبارت میں کبھی کبھی ژولیدگی پائی جاتی ہے۔

◆◆◆

بسمل الہ آبادی

سکھد یو پرشاد سنہا بسمل الہ آبادی۔ پہلے الہ آبادی میں بہبود کے دو سامان تھے اکبر اور امرود۔ اب اکبر تو رہے نہیں، امرودوں کا ساتھ بسمل نے دیا ہے۔ بسمل الہ آبادی حضرت نوح ناروی کے تلامذہ میں سے ہیں اور اپنے استاد پر جو ناز اس شاگرد کو ہے شاید ہی کسی اور شاگرد کو اپنے استاد پر ہوگا۔ ہر مشاعرہ میں اپنا کلام سنانے سے پہلے ایک آدھ رباعی اس قسم کی پڑھ دیتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ آپ نوح کے شاگرد ہیں۔ مثلاً ایک مصرعہ یاد ہے۔

شاگرد ہوں میں نوح سے طوفانی کا

حالانکہ پڑھتے اس طرح اکڑ کر ہیں گویا شاگردی کا ذکر نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ....... ”استاد ہوں میں عرفی وخاقانی کا“

پڑھنے کا انداز عدم تشدد کے منافی ہے آواز بلند ہے مگر اس کو بھی انتہائی بلندی پر پہنچانے کی کوشش فرماتے ہیں۔ بیٹھ کر پڑھ رہے ہوں تو ہر وقت کھڑے ہو جانے کا امکان رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی اسپرنگ پر تشریف فرما ہیں۔ پڑھتے ترنم سے ہیں، مگر کچھ الفاظ دانتوں میں اور کچھ ناک میں آکر اپنی ساخت بدل دیتے ہیں۔ مثلاً آپ کا مصرعہ ہے۔

موت آکے الٹ دے گی نقاب ہستی

اس کو اس طرح پڑھیں گے۔ ”مونت آکے وولٹ دیں گی نقابیں ہستی“

کلام میں شگفتگی اور روانی ہے۔ مشاعرے میں چھا جانے کی ترکیبیں بھی جانتے ہیں۔ اور کلام بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ مشاعرے کے باہر یعنی شاعر ہونے کے علاوہ بھی دلچسپ، پرخلوص اور دوست قسم کے آدمی ہیں۔

◆◆◆

بہزاد لکھنوی

سردار حسین بہزاد لکھنوی کو میں بہزاد کے علاوہ سردار حسین کی حیثیت سے بھی اس وقت سے جانتا ہوں جب بہزاد کم اور سردار حسین زیادہ تھے۔ طالب علموں کی حیثیت سے ان کو اس معاملہ میں شہرت حاصل تھی کہ بنتے بہت ہیں۔ زمین کی باتیں بہت کم کہتے تھے۔ ہر بات آسمان سے کم بلندی کی نہ ہوتی تھی۔

''بھی سردار حسین یہ شیروانی کا کپڑا تو خوب ہے۔''

''ہاں، مگر اب تو مل ہی نہیں سکتا۔ دو شیروانیوں کا بنا تھا۔ ایک شیروانی ڈیوک آف کناٹ کی بن گئی، دوسری یہ ہے۔''

آواز میں بھی تصنع ہوا کرتا تھا۔ بات کرتے ہوئے چہرہ بھی بڑے آدمیوں کی طرح اس طرح بن جاتا تھا۔ ایک دور وہ آیا کہ آپ نامی لکھنوی کے شاگرد کی حیثیت سے مشاعروں میں داد لیتے نظر آئے۔ پھر جو دیکھا تو ایسٹ انڈین۔ ریلوے میں ٹکٹ کلکٹر ہیں اور ایسی وردی پہنے پھر رہے ہیں کہ ہر طرف سے لیٹر بکس نظر آتے ہیں اسی ریلوے کی ملازمت نے اختلاج کا مرض پیدا کر دیا۔ نوکری چھوڑ دی۔ ولی اللہ بن گئے، نوکری اور داڑھی دونوں ساتھ ساتھ چھوڑی گئی۔ داڑھی اور اختلاج بڑھتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ گلے میں ہروقت مصنوعی گریبان میں ہروقت مصنوعی گریبان نظر آنے لگا اور آپ اس سے دل بہلاتے نظر آنے لگے۔

میرا ہی گریباں ہاتھ بھی میرے، تم کو اس سے مطلب کیا
کیوں روک رہے ہو دنیا والو مجھ کو دل بہلانے دو

آپ کی شہرت میں آپ کے کلام کے علاوہ آپ کے گریبان اور اختر بائی فیض آبادی کو بھی کافی دخل ہے۔ بہزاد اچھا کہتے ہیں۔ پڑھتے اس سے بھی اچھا ہیں۔ لیکن اگر کم کہاں کریں۔ اور زود گوئی کے کمالات کا مظاہرہ چھوڑ دیں تو اس سے بھی زیادہ اچھا کہہ سکتے ہیں۔ ان میں پوری صلاحیت موجود ہے جس کو جلدی میں وہ خود سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

◆ ◆ ◆

پریم چند

جس زمانہ میں اودھ اخبار کی میں ادارت کر رہا تھا۔ منشی پریم چند بھی مطبع نولکشور کے شعبہ تصنیف و تالیف کے ایک رکن تھے۔ اکثر ملاقاتیں رہا کرتی تھیں۔ صورت دیکھنے سے وہ اتنے بڑے آدمی کبھی نظر نہ آئے جتنے بڑے دراصل تھے حالانکہ صافہ تک باندھ کر انہوں نے خود دیکھ لیا۔

چھوٹی چھوٹی مگر تیز آنکھیں' کچھ پہاڑیوں کی طرح کا رنگ چہرے پر ذہانت مگر اتنی نہیں جتنے دراصل ذہین تھے۔ گریجویٹ تھے مگر دیہاتی نظر آتے تھے۔

ایک مرتبہ رسالہ ''نیرنگ خیال'' نے مجھ کو لکھا کہ منشی پریم چند کا ایک افسانہ کسی طرح دلواؤ۔ میں نے منشی صاحب سے کہا' کہنے لگے۔ ''بھئی شوکت صاحب تم اس قسم کی باتوں میں نہ پڑا کرو اب نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک تو افسانہ لکھنا پڑے گا۔ دوسرے منہ مانگے دام بھی نہ ملیں گے۔'' میں نے کہا ''افسانہ تو خیر لکھنا پڑے گا مگر دام منہ مانگے ہی لیجئے گا' ورنہ افسانہ نہ بھیجئے گا۔'' کہنے لگے ''یہ کیونکر ہو سکتا ہے چاہیے تو یہ کہ دام ہی نہ لوں۔ مگر اس طرح تم زندگی بھر کے لیے مصیبت میں مبتلا ہو کر میرے لیے بھی عذاب بن جاؤ گے۔ لوگ کہیں گے کہ پریم چند تالا ہے اور شوکت اس کی کنجی۔ آخر افسانہ لکھا۔ وی پی میں نے خود کیا اس لیے کہ پریم چند جی نے رقم مقرر کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ شرط صرف یہ تھی کہ نہ اپنا کوئی مزاحیہ مضمون سنانا نہ مجھ سے کبھی افسانہ سنانے کو کہنا۔ مگر کبھی کبھی یہ ہوتا تھا کہ کاغذ ہاتھ میں لیے ماتھے پر عینک لگائے' قلم روشنائی میں تر چلے آ رہے ہیں۔ ''ارے بھئی شوکت صاحب حضرت آدم کی بیوی کا کیا نام تھا؟'' عرض کیا۔ ''دادی کا نام بھول گئے؟'' کہنے لگے ''یہی کیا کم ہے کہ دادا کا نام یاد رہا۔'' عرض کیا ''حوا''

''حوا' حوا'' کہتے ہوئے واپس' پھر کبھی ہم پہنچ گئے۔ منشی جی رکشا بندھن کی تاریخ کیا ہے۔ اس کے جواب میں ایک پورا لیکچر سن لیا' پان کھا لیا' لیمنیڈ پی لیا' چلے آئے۔

اودھ اخبار تک یہ ملاقاتیں رہیں۔ منشی جی بنارس چلے گئے اور ہم اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا اور ہم سے یہ بھی نہ ہو سکا۔

◆ ◆ ◆

پطرس

سید احمد شاہ بخاری پطرس، کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ ان انڈیا۔ رسائل میں آپ کے مضامین پڑھا کرتے تھے اور دوسروں کو پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ کتے، سویرے جو کل آنکھ کھلی میری، بائیسکل۔ اگر سچ پوچھیے تو مزاح نگاری میں سب سے بڑا عیب شاعری کی طرح یہ ہے کہ مزاح نگار کو اس بات کا یقین ہی نہیں آتا کہ اس سے بڑا مزاح نگار بھی کوئی اور ہے۔ مگر پطرس کے مضامین پڑھ پڑھ کر کم سے کم مجھے ہر وقت اندازہ ہوتا رہا کہ مزاح نگاری میں یہ شخص کس قدر بلند و بالا ہے اور میں کس قدر پست۔ پطرس کی سطح پر پہنچ کر جب میں نے اپنے کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو یہ معلوم ہوا کہ قطب مینار کی آخری منزل پر چڑھ کر اوپر سے مولانا سہا کو دیکھ رہا ہوں جو سبزہ زار پر ایک موہوم سے نقطہ کی شکل میں متحرک نظر آ رہے ہیں۔

ریڈیو میں تقریروں کا سلسلہ میں دہلی جانا ہوا۔ کنٹرولر صاحب سے نہیں، پطرس سے ملنے ان کے دفتر گیا۔ سر سے لے کر پیر تک ایک انسانی شکل کا دماغ اپنی کرسی پر بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ بہت ہی خندہ پیشانی سے ملے۔ واجبی سی باتیں ہوئیں اور آخر وعدہ کر لیا کہ آپ کے نئے مجموعہ مضامین پر مقدمہ میں لکھوں گا۔

کچھ دنوں کے بعد ہم خود ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ مجموعہ کی ترتیب کے وقت پطرس کو احتیاطاً ان کا وعدہ یاد دلایا۔ جواب آیا کہ اب صورت حال کچھ اور ہے اب نہ آپ کے لیے مناسب ہے کہ مجھ سے مقدمہ لکھوائیں نہ میرے لیے مناسب کہ میں لکھوں۔ بات سچی تھی چپ ہو رہے۔

ذہین کہنا پطرس کی توہین نہیں ہے البتہ مجھے یہ ڈر معلوم ہو رہا ہے کہ ذہانت میں ان کے دماغ کی تمام کیفیت سما بھی سکتی ہے یا نہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا بڑا دماغ ایک محدود سے سر میں کیونکر آیا ہوگا۔ سنا ہے کہ انگریزی کے بہت بڑے ادیب تسلیم کیے جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اردو ہی کے کون سے چھوٹے ادیب ہیں۔ بہت کم لکھا ہے مگر جو کچھ ہے وہ ترازو کے ایک پلہ میں اور دوسرے میں ادب اردو کے مزاح کی تمام کائنات (اس کائنات میں اکبر الہ آبادی میں شامل نہیں ہیں) ایمانداری سے تولیے، ڈنڈی نہ ماریے تو پطرس ہی کا پلہ بھاری نظر آئے گا۔ شکر ہے کہ میں ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر یہ لکھ رہا ہوں ورنہ اس کو ایک قسم کا قصیدہ ہی سمجھا جا سکتا تھا۔ میری میز پر مضامین میں پطرس کا ایک نسخہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ لوگ چرا لے جاتے ہیں تو اس کی جگہ دوسرا فوراً آ جاتا ہے۔ میرے مزاح میں اگر کہیں کہیں پطرس سے سرقہ نظر آئے تو آپ مجھ کو چور نہ سمجھیں قصہ دراصل یہ ہے کہ پطرس مجھ پر طاری ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور میں بے

ساختگی میں ان کا اسلوب ادا یقینا چرا لیتا ہوں گا۔ ریڈیو نے تو ایک بہت اچھا کنٹرولر پا لیا ہے۔ مگر ادب اردو سے ایک بہت بڑا ادیب چھین کر اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے کاش پطرس اب بھی کبھی کبھی لکھتے رہیں سال میں صرف ایک مضمون سہی۔

◆ ◆ ◆

پیارے لال شاکر میرٹھی

دودھ کے دانت اچھی طرح نہ ٹوٹے تھے کہ بھائی جان (ارشد تھانوی) کے دوستوں سے دوستی پیدا کرنے کا شوق ہوا۔ بھائی جان کے دوستوں میں ایک صاحب تھے۔ اسماً ہندو، مذہباً عیسائی، تخلصاً مسلمان اور صورتاً کچھ بھی نہیں محض انسان۔ یہ تھے منشی پیارے لال شاکر میرٹھی۔ ادیب اور العصر ایسے رسائل کے ایڈیٹر۔

ایک تصویر میں ادھر ارشد صاحب ہیں۔ ادھر محمد حسین صاحب محوی۔ پیچھے شاکر صاحب اور ان کے بیچ میں ایک بچہ بیٹھا ہوا ہے۔ گرنٹ کی شیروانی پہنے، ترکی ٹوپی۔ دبلا پتلا، سوکھا سہا، یہ بچہ وہی ہے جو اس وقت یہ نقشہ کھینچ رہا ہے۔

شاکر صاحب نے ہمیشہ بزرگوں کا سا برتاؤ رکھا۔ ارشد صاح تو بے تکلف دوست بن بھی گئے مگر شاکر صاحب نے اپنی بزرگی نہ چھوڑی۔ لکھنو ریڈیو اسٹیشن پر اکثر ملتے تھے۔ سلام کے جواب میں ہمیشہ ''جیتے رہو'' کہتے ہیں۔ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر خوشی بھی ہوتی ہے۔ اس ''جیتے رہو'' میں جو ممتا ہے وہ کسی اور جواب میں کہاں ممکن ہے۔

شاکر صاحب کی ادبیت کا شباب ہمارا بچپن تھا۔ ہمارا شباب ان کا بڑھاپا بن گیا۔ اب وہ کچھ پینشنر سے نظر آتے ہیں۔ نہ وہ پہلی سی شگفتگی ہے نہ وہ زندگی کچھ کھلے کھلے سے نظر آتے ہیں۔ اگر غیور نہ ہوتے تو پوچھنے کی جرات ہو سکتی تھی کہ کیا گزر رہی ہے۔ مگر اس سوال کی ہمت کس میں ہے۔

◆ ◆ ◆

تاج

(سید امتیاز علی)

نئی نئی اردو سیکھی تھی۔ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی ریڈریں پڑھ رہے تھے کہ بھائی جان (ارشد تھانوی) نے اخبار پھول ہمارے نام جاری کرا دیا۔ سب سے پہلے جب اخبار پھول ہمارے نام آیا تو خوشی کا عالم نہ پوچھیے گویا ہم بھی اس قابل ہو گئے کہ ہمارے نام ڈاک آنے لگی پھر جب ہمارا چھپا ہوا پتہ آنے لگا تو گویا اور بھی اپنی قدر و قیمت کا احساس ہوا کہ جناب ہم وہ ہیں کہ ہمارا نام چھپ کر آتا ہے۔

اسی اخبار پھول کے زمانہ سے سید امتیاز علی تاج سے غائبانہ تعارف تھا۔ یہاں تک کہ ہم اخبار پھول کے مضمون نگار بھی ہو گئے۔ ہم تو خیر خاک ہوئے تھے۔ مضمون نگار بھائی جان نے ہمارے نام سے کہانیاں لکھ لکھ کر چھپوانا شروع کر دی تھیں اور اکڑتے ہم تھے۔

بچپن کا یہ نقش اس وقت ابھرا جب سید امتیاز علی تاج کا پہلا مزاحیہ افسانہ ''چچا چھکن نے تصویر ٹانگی'' پڑھا۔ اس کے بعد مزاح نگاروں کی فہرست میں ہم سب کے نام ساتھ ساتھ لیے جانے لگے۔ پہلی مرتبہ جب لاہور آئے تو دارالاشاعت میں سید امتیاز علی تاج سے ملنے گئے۔ لکھنوی تراش کا کرتہ چوڑی دار پاجامہ سلیم شاہی جوتا پہنے ہوئے انارکلی کے مصنف سے ملاقات ہوئی۔ خوبصورتی کے ساتھ مسکرا مسکرا کر پان چبا رہے تھے۔ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پہلی ملاقات تھی لہٰذا رسمی تکلفات ہی میں ختم ہو گئے۔

پھر سید امتیاز علی تاج کے ریڈیو ڈرامے سن سن کر ان سے قریب رہے۔ ان کے ڈرامہ کی صلاحیت کو تسلیم کیا۔ ریڈیو ڈراموں کے بعد ان کے فلمی افسانے خاندان اور زمیندار کی صورت میں دیکھے اور بلاوجہ خوش ہوتے رہے غالباً اس میں وطنیت کا جذبہ تھا۔ ہم وطن ہیں اور اچھل رہے ہیں لہٰذا ہم کو بھی اچھلنا چاہیے۔ منشی جی نامی ڈراموں کا مجموعہ شائع کرنے کا وقت دوسرے حصے کے مقدمہ کے لیے سید صاحب کو لکھا مگر جواب ندارد۔ تکلیف ہوئی مگر خاموش رہ گئے۔

اب پنچولی آرٹ پکچر میں آنا ہوا تو سید صاحب سے نسبتاً تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں ان کے ڈراموں کی سوجھ بوجھ کے اب بھی قائل ہیں۔ برجستگی اس قسم کے لوگوں میں ذرا کم باقی رہ جاتی ہے جو ادب کو تجارت بنا لیں۔ ہم لوگ قلم کے مزدور ہیں یہ ہمارا شوق ہی نہیں بلکہ روٹی بھی ہے۔ مگر امتیاز علی تاج میں ابھی تک برجستگی تازگی اور اپج جاتی ہے۔ عام راستے سے کترا کر اپنے لیے راستہ نکالتے ہیں۔ مگر بعد میں وہ راستہ شارع عام بن جاتا ہے اور امتیاز صاحب اپنے لیے کسی نئے راستہ کی تلاش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ تخلص معلوم نہیں کیوں ہے۔ شاعر تو

ہیں نہیں مگر تخلص یقیناً پکار تو رکھا نہ ہوگا۔ شاید شروع شروع میں بھی کچھ کہا ہو یا آئندہ کہنے کا ارادہ ہو اور حفظ ماتقدم کے طور پر تاج رکھ لیا ہو۔ اگر یہ تخلص امتیاز صاحب نہ رکھ چکے ہوتے تو علامہ تاجور نجیب آبادی کو غالباً اپنے تخلص میں خواہ مخواہ کا ''ور'' لگانے کی ضرورت نہ ہوتی۔

امتیاز صاحب ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔ بڑی میٹھی زبان ہے۔ اور بڑا دل آویز انداز گفتگو ہر چند کہ خالص تجارتی آدمی ہیں مگر صورت سے بالکل ساہوکار نظر نہیں آتے اور نہ ایک خرانٹ قسم کے سرمایہ دار بلکہ تجارت میں تاجر بن کر نہیں ادیب ہی بن کر کرتے ہیں۔ البتہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خوش قسمت ادیبوں میں ہیں جو ادب کی گود میں پل کر ادبی فضاؤں میں پروان چڑھتے ہیں اور ان کو ہوش کی آنکھیں کھول کر اپنے لیے میدان عمل سجا سجایا۔ بنا بنایا مل گیا تھا۔ دوسرے ادیب خود کنواں کھود کر پانی پیتے تھے۔ یہ پانی پی کر اگر دل چاہتا ہے تو کنواں کھود لیتے ہیں۔ ورنہ ایسے پیاسے نہیں ہیں کہ کنواں ضرور ہی کھودیں۔

لاہور آ کر اور امتیاز صاحب سے مل کر اس راز کا انکشاف ہوا ہے کہ آپ گھوماؤ پھراؤ کے ساتھ ہمارے کچھ عزیز بھی ہیں، رشتہ سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ کیا ہے مگر یہ طے ہو چکا ہے کہ رشتہ ہے ضرور کچھ نہ کچھ۔ خدا کرے کچھ اچھا ہی رشتہ ہو۔

◆◆◆

تاجور نجیب آبادی

مولانا تاجور نجیب آبادی ایک مرتبہ لکھنو تشریف لے گئے تھے۔ حکیم آشفتہ صاحب نے آپ کو دعوت دی تھی۔ اور یہ خاکسار بھی اس دعوت میں شریک تھا۔ اب تک وہی ایک ملاقات ہے جو مولانا سے ہوئی۔ نہایت بھاری بھر کم شاعر ہیں' کلام بھی ٹھوس اور خود بھی۔ تحت اللفظ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ہانپتے جاتے ہیں۔ دوسری مرتبہ جب آپ سے ملنے گیا تو باہر ہی بھاگ آیا۔ کمرہ سے نہایت خوفناک آوازیں آ رہی تھیں بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا سو رہے تھے اور یہ آوازیں خراٹوں کی تھیں۔

◆◆◆

تبسم نظامی

ماموں ہیں ساغر نظامی کے مگر بھانجا گردانتے ہیں تمام دنیا کو۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ عادات و اطوار بھانجے میں ماموں کے آتے، مگر ان ماموں نے بھانجے کی ادائیں اپنانے کی پوری کوشش کی ہے اور یہ ادائیں اس لیے بھونڈی نظر آتی ہیں کہ ساغر کی ان اداؤں کے پس منظر ان کا حسن۔ ان کی ذہانت ان کی ادبی شہرت اور ان کی آواز وغیرہ ہے۔ مگر آپ کی ان اداؤں کے پس منظر آپ خود ہی ہیں۔ نہ حسن ہے نہ غیر معمولی ذہانت نہ ادبی شہرت اور نہ آواز مگر یہی خیال کیا کم ہے کہ میں ایسے شہرۂ آفاق بھانجے کا ماموں ہوں۔ اگر تبسم صاحب ساغر کے ماموں نہ ہوتے تو شاید اپنی انفرادیت کا کچھ بھرم رکھ لیتے۔ مگر...... ’’ڈبویا ان کے ہونے نے نہ ہوتے یہ تو کیا ہوتے؟‘‘

ساغر صاحب کے طفیل میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ پھر ایک مرتبہ لکھنؤ میں آپ مہمان ہوئے اور وہ بھی اس طرح کہ دفتر سے گھر آ کر معلوم ہوا کہ کوئی صاحب مہمان آتے ہوئے ہیں جنہوں نے آتے ہی ملازم کو مارنے کے علاوہ باقی سب کچھ کہہ سن کر برطرف کر دیا ہے اور خود گھومنے گئے ہوئے ہیں۔ حیرت ہوئی کہ یا اللہ ایسا کون مہمان ہو سکتا ہے جس کو یہ گھر والے جانتے بھی نہیں اور جس کو حقوق اتنے حاصل ہیں کہ ملازم تک کو اپنے ذاتی اختیار سے کام لے کر برطرف کر دیا ہے۔ بہت دماغ لڑایا کہ ہمارے کون سے چچا یا ماموں یا خالو یا پھوپھا وغیرہ ایسے ہو سکتے ہیں جو از راہ شفقت تشریف لے آئے ہوں۔ بغیر کسی اطلاع کے اور ضروری نہ سمجھا ہو اپنا تعارف کرانا گھر والوں سے مگر سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے تو نہیں ساغر صاحب کے ماموں پھنپھناتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ دل کو اطمینان ہو گیا کہ اپنے نہ سہی اپنے دوست کے ماموں ہیں لہٰذا اپنے ہی ماموں ہوئے۔ آتے ہی کہنے لگے۔

’’سخت بدتمیز ملازم رکھتے ہیں آپ، یعنی اس کو یہ بھی تمیز نہیں کہ گفتگو کرنا بجائے خود ایک فن ہے۔‘‘

عرض کیا۔ ’’مجھے سخت ندامت ہے مگر آخر ہوا کیا۔‘‘

برہمی سے بولے۔ ’’ہوتا کیا، یعنی میں تو کہتا ہوں کہ کمرہ کھولو اور وہ کہتا ہے کہ ہم تو آپ کو پہچانتے نہیں۔ گویا ایک شاعر چور ہو سکتا ہے، ایک ادیب لفنگا ہو سکتا ہے۔‘‘

ندامت سے عرض کیا۔ ’’وہ جاہل ہے اور تعلیم یافتہ ملازم رکھنے کی استطاعت نہیں ہے۔ بہرحال آپ نے اچھا کیا کہ اس کو سزا دے دی۔‘‘

شیروانی ٹانگ کر بولے۔ ’’بہرحال کھانے میں کیا دیر ہے؟‘‘

دست بستہ عرض کیا۔ ''تیار ہے'' اور فوراً ہی کھانے کا انتظام کر دیا۔ تبسم صاحب نے اس عرصہ میں لباس تبدیل کیا۔ اور کھانے پر آ گئے۔ مگر کھانا دیکھ کر آگ بگولہ ہی تو ہو گئے۔

''ایک شاعر کی قیمت بس یہی ہے۔''

حیرت سے پوچھا۔ ''میں سمجھا نہیں' کیا مطلب ہے آپ کا؟''

فرمایا۔ ''یعنی بس یہ کھانا' سبحان اللہ! ایک ادیب اور ایک شاعر کی کیا خوب قیمت مقرر کی ہے آپ نے۔''

کھانا یقیناً روزمرہ کا تھا' تکلف قطعی نہ تھا مگر اس وقت جو ندامت ہو رہی تھی وہ کچھ عجیب قسم کی تھی یعنی اپنے اوپر یا اپنے کھانے پر شرم نہیں آ رہی تھی بلکہ تبسم صاحب پر شرم آ رہی تھی کہ یہ اس قسم کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔

وہ دور گزر گیا۔ تبسم صاحب عرصہ تک غائب رہنے کے بعد پھر جو ملے تو بالکل دوسری چیز تھے نہ وہ تیزی نہ وہ تصنع بلکہ کچھ سلجھے ہوئے سے آدمی تھے۔ ارادہ ہوا کہ ان سے شکایت کریں کہ آپ کہیں اور کیوں ٹھہرے ہیں۔ مگر ڈر لگا کہ گھر پہنچ کر اگر یہ پہلے ہی جیسے ہو گئے تو پھر نیا ملازم ڈھونا پڑے گا۔

◆ ◆ ◆

ثاقب لکھنوی

مرزا ذاکر حسین قزلباش۔ اس قدر ضعیف کہ عمر کا اندازہ کرنے سے جی گھبرانے لگتا ہے۔ مگر دل چاہتا ہے کہ ابھی اور زندہ رہیں۔ ایسے لوگ پھر کہاں ملیں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ''اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو'' اور میں کہتا ہوں کہ ''اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں خوب کہو''

آنکھوں سے تقریباً معذور ہیں۔ ضعیفی اپنے شباب پر ہے۔ پٹاری کے انگوروں کی طرح ضرورت اس کی ہے کہ روئی کے پھلوں میں ان بزرگوں کو حفاظت سے رکھا جائے مگر اب تک مشاعرہ باز حضرات ان بیچاروں سے لمبے چوڑے سفر کراتے ہیں اور یہ ان ہی کا دل گردہ ہے کہ مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں ہم تو اگر خدانخواستہ اس عمر کو پہنچتے تو انگلی پر ڈالنے کے قابل ہو جائیں گے مگر ثاقب صاحب کو میں نے خود دیکھا ہے کہ بلا کی سردی ہے، دور دراز کا سفر ہے اور آپ اپنے اخلاق سے مجبور چلے جا رہے ہیں۔ مشاعرے کی شرکت کے لیے پھر مشاعرے میں اس ضعیفی کے باوصف پڑھتے۔ جس شان سے ہیں اگر ہم اس طرح دو غزلیں بھی پڑھ دیں تو خون تھوکنے لگیں ورنہ حلق کا کوا تو ضرور باہر نکل آئے۔ میں تو جب تک ثاقب صاحب کی غزل سنتا رہتا ہوں۔ گھبرا گھبرا کر دعائیں کرتا ہوں کہ ''الہٰی خیر'' ایک طوفان ایک پہاڑوں کو ٹکرا دینے والے بھونچال بلکہ ایک محشر کی سی کیفیت ہوتی ہے نہ جانے جوانی میں کس طرح پڑھتے ہوں گے۔

کلام استادانہ ہوتا ہے اور استادانہ کیوں نہ ہو۔ ۵۸ سال سے عروس سخن کی مشاطگی کر رہے ہیں۔ میر کی زبان اور غالب کی تخیل پیدا کرنے کی ہمیشہ کوشش کی۔

میں بھی ان گنہگاروں میں سے ہوں جو اس ضعیفی پر ترس نہیں کھاتے۔ مشاعروں میں کسی نہ کسی طرح بلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھوپال کے مشاعرے کے لیے مرزا صاحب کو میں نے تیار کیا۔ کہنے لگے ''شوکت میاں نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی دن کہ بس مشاعرے ہی میں یہ چراغ گل ہو جائے گا۔'' عرض کیا۔ ''خدا نہ کرے، زندگی بھر آپ نے جس شاعری کی خدمت کی ہے اس کے دامن پر اتنا بڑا داغ لگانا آپ کیسے گوارا کریں گے۔'' بڑی زور سے ہنسے۔ اور فرمایا ''اچھا بھائی چلوں گا۔ حکم حاکم مرگ مفاجات'' چنانچہ تشریف لے گئے۔ تکلیف اٹھائی مگر بات نہ ٹلی۔

◆ ◆ ◆

جالب دہلوی

استاذی میر بشارت علی جالب دہلوی۔ روزنامہ ''ہمدم'' لکھنو کے ایڈیٹر تھے اور ہمدم کے ڈائریکٹر خان بہادر سید احمد حسین رضوی ایم بی ای نے مجھے ہمدم کے دفتر بھیجا تھا کہ میں مترجم کی حیثیت سے کام کروں۔

ترکی ٹوپی پہنے جس کا پھندنا آگے پڑا ہوا تھا اور پھندنے کے آگے سفید بالوں کا گچھا ٹوپی سے پناہ مانگ کر نکلا بھاگتا تھا۔ پریشان سی سفید داڑھی ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں قلم۔ میز سے کچھ ہی اٹھا ہوا سر۔ اس سج دھج سے ایک بزرگ اس طرح لکھنے میں مصروف تھے گویا اونگھ رہے ہیں۔ میرے آنے کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ لکھتے رہے، برابر لکھتے رہے۔ نہ کچھ سوچنا نہ غور کرنا بس لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اتفاقاً کاتب کے آجانے سے گردن اوپر اٹھی۔ موقع دیکھ کر میں نے عرض کیا۔ ''السلام علیکم''

نہایت کرخت آواز میں جواب ملا۔ ''وعلیکم السلام'' خان بہادر صاحب کا خط چپکے سے دے دیا۔ پڑھ کر دزدیدہ نگاہوں سے پہلے تو دیکھا۔ اس کے بعد میرا شجرہ شروع کر دیا۔

''آپ کے چچا صاحب قبلہ نے دہلی سے روزانہ اخبار نکالا تھا میں اس میں کام کر چکا ہوں بلکہ وہ میرے ایک قسم کے استاد ہیں اور آپ کے ایک بڑے چچا لندن تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے پھر واپس تشریف ہی نہ لائے۔ آپ کے والد صاحب بھوپال میں تھے۔ وغیرہ وغیرہ

میں حیرت سے ان کا منہ دیکھ رہا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ ان کو کیسے معلوم ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کو میرے ہی متعلق نہیں ہر ایک کے متعلق عام طور پر معلوم ہوا کرتا تھا کہ وہ کون ہے کیا ہے۔ اس کا خاندان کہاں سے متعلق ہے۔ اس کی دادی کے کتنی مرتبہ آپریشن ہوا تھا۔ اس کی نانی کی موت کس مرض میں واقع ہوا ہوئی اور اس کے ایک خالو کو کس جرم حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ یہ مقدمہ کن کن عدالتوں میں رہا۔ کس کس وکیل نے کیا کیا جرح کی' وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی باتیں ہم آپ سب سنا کرتے ہیں۔ مگر یاد نہیں رکھتے۔ میر صاحب کے دماغ میں بلکہ کان میں ایک مرتبہ کوئی بات پڑ جائے پھر کیا مجال کہ وہ اسے بھول جائیں۔ وہ بات دماغ سے نکلنے کے لیے پھڑ پھڑائے گی مگر میر صاحب کا دماغ یادداشت کا ایسا پنجرہ تھا جس میں کوئی صید ایک مرتبہ آ کر پھر کبھی رہا نہیں ہوا۔

مختصر یہ کہ ہمدم میں ملازم ہو گئے۔ میر صاحب نے رگیدنا شروع کر دیا۔ ہمارے سیاہ حروف کی عبارت پر ان کی سرخ رنگ کی اصلاح ہونے لگی۔ شروع شروع میں تو سیاہ عبارت تمام کی تمام قلمزد ہو جاتی تھی اور اس کی جگہ میر صاحب کی سرخ عبارت ہماری نالائقی پر خون کے

آنسو بہاتی نظر آتی تھی۔ اس کے بعد سیاہ و سرخ عبارت کا تناسب ایسا ہوگیا کہ گویا قتل عام تو ہوا تھا مگر کچھ ہندوستانی بچ گئے ہیں غالباً سرکاری گواہ بن گئے تھے۔ رفتہ رفتہ خون کی ایک آدھ چھینٹ اور پھر خال خال سرخ رنگ کی چمک مگر یہ کبھی نہ ہوا کوئی چیز بغیر اصلاح کے رہ گئی ہو۔ ترجمہ ہو‘ شذرہ ہو‘ مزاحیہ کالم ہو‘ ہر جگہ اصلاح موجود اکثر تو اصلاح پر غصہ ہی آتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ ہمت کر کے لڑ بیٹھے۔ ہم نے لکھا تھا ایک جگہ ’’نقطہ نگاہ‘‘ آپ نے اس کو کاٹ کر لکھ دیا۔ ’’زاویہ نگاہ جلبلاتے ہوئے وہ اصلاح لے کر میر صاحب کے پاس پہنچے۔

’’آپ نے نقطہ نگاہ کاٹ کر زاویہ نگاہ بنا دیا ہے۔ اس میں کیا فرق پیدا ہوگیا۔‘‘

سر جھکائے ہوئے بولے۔ ’’بہت بڑا فرق ہے دونوں میں نقطہ نگاہ تیقن کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ گویا آپ کی نظر پورے وثوق کے ساتھ ایک خاص نقطہ پر ہے اور زاویہ نگاہ میں شک کا احتمال باقی رہتا ہے گویا نگاہ نے نقطہ تک پہنچنے کا ایک زاویہ تو بنالیا ہے مگر ابھی وہ نقطہ دریافت نہیں کیا ہے۔ جس موقع پر آپ نے لکھا ہے وہاں زاویہ نگاہ زیادہ سجتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ سائنس کمیشن کے متعلق ہمارا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ حکومت نے اپنے تدبر کے فقدان کا ایک اور ثبوت دیا ہے۔ اگر یہاں زاویہ نگاہ لکھ دیجیے تو پھر آپ پر نتیجہ کی ذمہ داری نہیں رہتی اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ سائنس کمیشن کا مقصد اپنے نتیجہ پر پہنچ کر عین تدبر ثابت ہوا۔ اس وقت اگر زاویہ نگاہ غلط بھی ہوجائے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے مگر نقطہ نگاہ کا غلط ہونا ایک صحافی کی موت ہے۔

اپنا سامنہ لے کر چلے آئے۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی اصلاحوں کا سلسلہ آخر آخر وقت تک جاری رہا۔ میر صاحب کو زندہ انسائیکلوپیڈیا کہا جاتا تھا۔ کسی موضوع پر گفتگو کیجیے‘ بات کریں گے‘ بات کی جڑ بتائیں گے یہاں تک کہ پھنگی بھی بتا جائیں گے۔ حلوہ سوہن‘ خمیرہ‘ سرطان‘ مثنوی مولانا روم‘ خاندان پہلوی‘ گاما پہلوان‘ پلاؤ کی پخت۔ عرض تو کیا کوئی موضوع لے لیجیے .... گھنٹوں تقریر کریں گے اور اس وثوق سے موضوع کے ہر پہلو کو نمایاں کریں گے۔ گویا یہ آپ کا خاص Subject رہا ہے۔

میر صاحب کو شوق صرف دو تھے۔ افیون اور کتابیں۔ افیون کھانے کو رندی کہتے تھے اور جہاں تک ہوتا تھا اس کھلی ہوئی حقیقت کو راز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے کے سلسلے میں ہر تکلیف گوارا تھی۔ اتوار کے دن نخاس میں لب سڑک کسی کباڑیے کی دکان پر بیٹھے ہوئے ہیں اور پرانی کتابوں میں دیمک کی طرح لگے ہیں۔ کیا مجال کہ پھر کوئی ہنگامہ ان کو اپنی طرف متوجہ کرلے۔ مقرر بھی بہت اچھے تھے۔ کاش تقریر کرنے میں کبھی کبھی سانس لے لیا کرتے۔

کھانے کے شوقین تھے اور فطرتاً میٹھی چیزوں سے خاص رغبت تھی۔ دعوتوں میں جہاں تک ہوتا تھا خود ہی جاتے تھے۔ اسٹاف کے کسی اور رکن کو تکلیف دینا پسند نہ کرتے تھے۔ مشکل ہی سے کوئی دعوت ایسی ہوتی ہوگی جس میں شیروانی کا کالر اور سب سے پہلا بٹن لگانے کے بعد باقی سب کو کھلا چھوڑ کر جوتے کی ڈوری سڑک پر لوٹتی ہوئی ترکی ٹوپی کا پھندنا پیشانی پر جھولتا ہوا ایک ہاتھ میں چھڑی اور رومال اور

دوسری مٹھی میں سگریٹ لیے آپ تشریف نہ لائے ہوں۔ آتے ہی السلام علیکم کی جھنکاردار آواز محفل میں گونج جاتی تھی۔ پھر لوگ گھیر لیتے تھے اور کوئی نہ کوئی موضوع چھڑ ہی جاتا تھا۔ ایک محفل کے لیے صرف ایک موضوع کافی ہوا کرتا تھا۔

’’ہمدم‘‘ کے بعد خود ہمت کر کے اپنا روزنامہ نکالا ’’ہمت‘‘ نام رکھا۔ اور اسی ہمت کو زندہ چھوڑ کر خود ختم ہو گئے۔ معلوم نہیں کتب خانے کا کیا حشر ہوا۔ عجیب عجیب نایاب کتابوں کا نہایت قیمتی ذخیرہ تھا، جس کا اب کوئی پتہ نہیں۔

◆ ◆ ◆

جذبی

(معین احسن)

تقریباً پندرہ برس کا ذکر ہے کہ جھانسی میں ایک مشاعرہ تھا۔ حامد صاحب شاہجہانپوری کے اصرار نے مجھے بھی کھینچ بلایا۔ ان کے گھر پر ایک صاحبزادے سے ملاقات ہوئی جن کا تخلص تھا ملال۔ نہایت شوخ وشنگ بچہ اور تخلص ملال! حامد صاحب سے پوچھا۔ یہ کیا لغویت ہے۔ کہنے لگے' غسل کر کے سو جاؤ گرمی بہت ہے اور رات کو جاگنا ہے۔ پھر بتائیں گے۔

جھانسی کے بعد لکھنو میں ان ملال صاحب سے اکثر نیاز حاصل ہوتا رہا۔ ایک دن یہ معلوم ہوا کہ علی گڑھ سے ایک نوجوان شاعر آئے ہوئے ہیں' جذبی۔ رفیع احمد خان صاحب نے کہا۔ میرے یہاں چلو وہ بھی آ رہے ہیں۔ وہاں جا کر جو دیکھا تو ملال صاحب خوش خوش بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوا کہ آپ ہی جذبی ہیں۔ سمجھ گئے کہ مذاق ہو رہا ہے۔ بیوقوف بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر ملال صاحب نے خود ہی بتا دیا کہ میں واقعی ملال نہیں رہا ہوں جذبی ہو گیا ہوں۔ کلام سنا۔ خوب تھا۔ پالنے میں جو پیر جھانسی میں نظر آئے تھے وہ اب کلیلیں بھرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ بلا کی ترقی تھی۔ پھر یکا یک پتہ چلا کہ جذبی صاحب ترقی پسند ادیب ہو گئے ہیں۔ لکھنو ریڈیو اسٹیشن پر ترقی پسند شعراء کے ایک مشاعرے میں آپ بھی تشریف لائے اور معلوم ہوا کہ واقعی ترقی پسند مصنفوں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اتنی ترقی تو میں نے بھی محسوس کی کہ پہلے جھانسی میں شوکت صاحب کہہ کہہ کر بچھے جاتے تھے اب ”اماں شوکت یار شوکت“ کہہ کر اکڑتے جاتے ہیں۔ خدا کرے اس سے زیادہ ترقی نہ کریں۔

آپ کا آرٹ برابر ترقی کر رہا ہے۔ طالب علمی ختم ہونے کے بعد ایک انقلاب اس آرٹ پر اور آئے گا۔ وہ دیکھیں کیا ہوتا ہے!

◆◆◆

جگر مراد آبادی

بیگم صاحبہ کے والد محترم حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب قبلہ مرحوم مین پوری میں مقیم تھے۔ لہذا اسرالی مشاعروں میں شرکت سے انکار کرنے کی جرات مجھ ایسے دامادی میں مبتلا کمزور انسان میں کیونکر ہوسکتی تھی۔ مین پوری جانا پڑتا تھا اور مشاعروں میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ اس زمانہ میں حضرت جگر مراد آبادی کا مرکز بھی مین پوری تھا۔ سب سے پہلے وہیں نیاز حاصل ہوا۔ وہیں مراسم بڑھے۔ بے تکلفی کی حد تک پہنچے اور گستاخیوں کے قریب پہنچ پہنچ کر رہ گئے۔

جگر سے تو خیر ہر ایک کو خلوص ہوسکتا ہے لیکن جگر کو مجھ سے کیوں خلوص ہوا۔ اس کی خبر مجھے آج تک نہیں ہے۔ جگر ایک رند مشرب’ بلا نوش’ انتہائی غیر ذمہ دار آدمی اور خلوص کی ذمہ داری کو اس طرح محسوس کرتا تھا کہ کبھی سرمستی کے عالم میں بھی مجھ کو اپنے سے خفا نہ ہونے دیا۔ لکھنو میں ہیں۔ خوب پئے ہوئے میرے یہاں آ گئے۔ تقاضا ہے اور پئیں گے’ ساتھ میں شراب بھی ہے یہ مطلب نہیں کہ منگا دو’ صرف اجازت طلب کی جا رہی ہے۔ منع کر دیا’ ہنس دیئے۔ پھر تقاضا شروع ہوا’ ڈانٹ دیا۔ زبردستی کی اور بوتل غائب کر دی۔ اب تلملا رہے ہیں’ بے چین ہیں مگر ڈر بھی رہے ہیں کہ شوکت خفا ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ بہانے کر کے بھاگنا چاہا۔ اس میں بھی کامیاب نہ ہوئے تو جھوم جھوم کر غزلیں سنانے لگے۔

جگر کو حسن سے کوئی تعلق نہیں اگر کوئی تعلق ہے بھی تو بدصورتی سے ہے مگر اپنا کلام پڑھتے ہوئے وہ ہمیشہ حسین نظر آئے ہیں ان پر عاشق ہو ہو گیا ہوں۔ میں نے اسی بدصورت اجاڑ شرابی کے بوسے لیے ہیں۔

بھوپال کے مشاعرے میں اطلاع ملی کہ جگر آئے تو ہیں مگر محفل میں آنے کے قابل نہیں ہیں۔ برابر پی رہے ہیں۔ بہاری چرن صادق اسٹیٹ ایڈووکیٹ اور تربینی سرن شاد سب جج دونوں نے مجھے پکڑا کہ جگر کو سنبھالو۔ میں پہنچا جگر کو سنبھالا۔ رات بھر لیے بیٹھا رہا اور صبح ہوتے مشاعرے میں پیش کر دیا۔ جگر نے غزل پڑھی۔ ہوش میں آ گئے۔ گلے لگ کر معافی مانگ لی۔ معاف کر دیا۔ اس ظالم کو کیسے نہ معاف کرتا۔

مژدہ سنا کہ جگر تائب ہو گئے۔ پھر خبر سنی کہ جگر نے شادی کر لی۔ پھر اطلاع آئی کہ جگر اپنی توبہ پر قائم ہیں اور اپنی پچھلی زندگی پر شرمسار ہیں۔ میں ان خبروں پر اس طرح خوش ہو رہا تھا گویا مدت سے بیمار تھا اب صحت ٹھیک ہو رہی ہے۔ آخر بالکل تندرست ہو گیا۔ گونڈہ پہنچا’ جہاں گھر گرہستوں کی سی شریفانہ پاکبازانہ معقول اور شاندار زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر لپٹ گئے۔ بیوی والے

تھے۔ گھر کا ایک نظام تھا۔ بالوں میں کنگھی کرتے تھے۔ وضو کر لیتے تھے، نماز پڑھتے تھے اور کیا چاہیے۔ اب تک دل کو اس انقلاب کا یقین اس طرح نہیں آتا جیسے کسی کو ڈربی لاٹری مل جائے اور دوست تک اس حقیقت کو خواب سمجھتا رہے۔

جگر کی شاعری پر تبصرہ کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ وہ تنہا غزل گو ہے۔ اس کی غزل صرف غزل نہیں ہوتی اور بھی بہت کچھ ہوتی ہے۔ کسی بڑے آرٹسٹ کے آرٹ کو الفاظ میں بیان کرنا اس کے آرٹ کو محدود کر دینا ہے۔

جگر قیامت کے بذلہ سنج بھی ہیں۔ ایک مرتبہ ایک صاحب ان کے کلام کی نہایت بے محل تعریف کر رہے تھے۔ ایسی تعریف کہ خود جگر بھی زندگی سے بیزار بیٹھے تھے۔ ان صاحب نے کہا۔ ”جگر صاحب آپ کا فلاں شعر تو ایسا ہے کہ ایک جگہ میں نے اسے پڑھ دیا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ پٹتے پٹتے بچا۔“

جگر نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”میرا سب سے ناکام شعر وہی ہے۔“

جگر کے لیے پہلے مارے محبت کے میں مرنے کی دعائیں کیا کرتا تھا اب جی چاہتا ہے کہ وہ زندہ رہیں۔ میں دشمن نہیں ہو گیا ہوں بلکہ جگر زندہ رہنے کے قابل بن گئے ہیں۔

◆◆◆

جوش ملیح آبادی

جوش صاحب، رفیع احمد خان کے ویسے ہی دوست ہیں جیسے رفیع احمد خان میرے دوست ہیں۔ لہٰذا یہ کیونکر تھا کہ جوش صاحب سے میرے تعلقات قریب کے نہ ہوتے۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے ادبی حیثیت سے کم اور انسانی حیثیت سے زیادہ ملتے شعروشاعری کا تذکرہ یوں کبھی ہو جاتا ہے۔ ورنہ عموماً ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کو ادب سے نہیں البتہ بے ادبی سے متعلق کہا جا سکتا ہے۔

جوش صاحب کو شاعر اعظم، شاعر انقلاب اور عہد حاضر کے سب سے بڑے نظم گو شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔ مگر میں ان کو اس حیثیت سے نہیں بلکہ آدمی کی حیثیت سے...... مگر یہ بات تو ابھی میں کہہ چکا ہوں۔ تو خیر جوش صاحب ملیح آبادی شاعر بعد میں ہیں، پہلے پٹھان ہیں۔ مسلمان ہونے سے وہ انکار کر سکتے ہیں مگر دو باتوں سے ان کو انکار نہیں ہو سکتا، ایک پٹھان ہونے سے دوسرے سید الشہداء حضرت امام حسین سے۔ وہ خدا اور اس کے رسول سے لوگ کہتے ہیں کہ منحرف ہیں، مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ خدا کے رسول کے نواسے کی بڑی عظمت ان کے دل میں ہے۔ ''خدا کی باتیں خدا ہی جانے''

لیکن اگر جوش صاحب کا عقیدہ خدا کے متعلق غلط نکلا تو بھی کیا عجب ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے سے جو عقیدت ہے وہی ان حضرت کو جنت میں پہنچا دے۔ حالانکہ یہ عقیدت مذہبی حیثیت سے نہیں، سیاسی حیثیت سے ہے۔

تو میں میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جوش صاحب کا پٹھان ہونا شاعر ہونے سے بھی زیادہ یقینی ہے۔ چنانچہ ان کے کلام میں بھی لٹھ بازی، مردانگی، جنگجوئی، خونخواریت اور غیظ و غضب نظر آتا ہے۔ جس کو لوگ انقلاب پسندی کہتے ہیں اور یہی جوش، جوش کی شاعری کی روح ہے۔

جوش نہایت دلچسپ مگر نہایت خطرناک دوست ہیں۔ خطرے پیدا کر کے ان سے کھیلنا اور دوسرے کو خطرے میں مبتلا کر کے اس سے لطف لینا آپ کا خاص مشغلہ ہے۔ یوں تو اس وقت بہت سے واقعات یاد آ رہے ہیں مگر مشتے نمونہ از خروارے، کانپور کا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ جوش، رفیع احمد خان، سراج لکھنوی، قدیر لکھنوی، نشتر سندیلوی اور میں...... یہ چھ آدمی گنگا کے کنارے پہنچے۔ ایک کشتی کرایہ پر لی اور بوٹنگ شروع کر دی۔ یکایک کشتی جیسے ہی دھارے پر پہنچی آپ ایک دم کھڑے ہو گئے۔ کشتی کے ایک کنارے پر ایک پیر اور دوسرے کنارے پر دوسرا پیر رکھ لیا اور اب مصر ہیں کہ ''ڈگمگ ڈولے نیا'' کی نرت دکھاؤں گا۔ سب نے منع کیا، خوشامدیں کیں۔ انہوں نے کہا، سلام کرو۔ سلام کیے۔ کہنے لگے، ہاتھ جوڑو۔ ہاتھ جوڑے۔ ارشاد ہوا کہ اس وقت تم سب کی زندگی میرے اشاروں پر ہے۔ عرض کیا، بجا ارشاد فرماتے ہیں جناب۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود پیروں کو ایسی حرکت دیتے رہے کہ ناؤ واقعی ہچکولے کھانے لگی۔ یہاں تک کہ خود

ملاح نے کہا کہ صاحب ڈوب جائے گی ناؤ۔ کہنے لگے‘ یہی تو میں چاہتا ہوں۔ ہر ایک کے جسم میں خون منجمد اور چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ آخر نشتر سندیلوی نے نہایت غصہ سے ڈانٹا۔ غصہ پر آپ اور مشتعل ہوئے اور ناؤ کو اس بری طرح زیر وزبر کیا کہ ہم سب نے کلمہ پڑھ کر آنکھیں بند کر لیں اور نشتر سندیلوی جوش کے قدموں پر گر پڑے۔ خدا خدا کر کے یہ طوفان تھما۔ جوش کی تفریح اور ہم سب کا نزع کا عالم ختم ہوا۔ اب یہ واقعہ مذاق معلوم ہوتا ہے لیکن اس مذاق کے حادثہ بن جانے میں دیر ہی کیا تھی۔

اس قسم کے خطروں سے کھیلنا آپ کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ رفیع احمد خان کے دفتر پہنچے ان سے کہا کہ پانی اس شرط پر پیوں گا کہ تم خود لا کر پلاؤ۔ وہ غریب پانی لینے چلا گیا اور آپ نے سامنے کھلے ہوئے فائل پر ایک جگہ انگریزی میں ایک موٹی سی گالی اس طرح لکھ دی کہ گویا کوئی بات ہی نہیں ہے۔ وہ کاغذ براہ راست یوپی گورنمنٹ میں جا رہا تھا۔ میں نے چلتے وقت چپکے سے رفیع احمد خان کو بتایا کہ یہ حرکت فرمائی ہے۔ ورنہ نہ جانے اس شرارت کا کیسا سنجیدہ نتیجہ برآمد ہوتا۔ ریڈیو کے مشاعروں میں میرے لیے تعارف کرانے کی مصیبت مقرر ہو چکی تھی اور آپ مائیکروفون کے قریب بیٹھا کرتے تھے۔ اب وہاں آزادی سے نہ جانے کیا کیا فرما رہے ہیں اور یہاں یہ ڈر کہ یہ گفتگو نشر نہ ہو جائے۔ بس اسی ڈر سے لطف لے رہے ہیں اور گفتگو میں زیادہ جری ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مجھ کو غصہ آ جاتا تھا مگر یہی غصہ تو ان کی کامیابی کی سند ہوتا تھا۔

◆◆◆

حافظ محمد عالم

لاہور کے رسالہ ”عالمگیر“ کے ایڈیٹر ہیں۔ میں اس رسالہ میں کبھی کچھ لکھا کرتا تھا۔ اب کچھ نہیں لکھتا۔ اس لیے کہ حافظ صاحب سے ناراض ہوں۔ اس ناراضگی کی وجہ آج تک کسی کو نہیں بتائی اور اگر سچ پوچھیے تو اب خود تو مجھے بھی یاد نہیں کہ کیوں ناراض ہوا تھا مگر وضع داری کے ماتحت ناراض ہوں۔

حافظ صاحب سے سب سے پہلے نیاز حاصل ہوا تھا۔ سیدھے سادے مسلمان نظر آتے تھے۔ رسالہ جاری کرنے میں ادبی ذوق سے زیادہ تجارت کو دخل نظر آتا تھا۔ خاص نمبر اور سالانہ نمبر خوب شائع کرتے تھے۔ خوب سے مراد رنگین تصویریں اور بڑے سائز پر موٹی سی جلد ہے۔

ایک مرتبہ لاہور میں بھی ملاقات ہوئی۔ ادبی گفتگو بہت کم کرتے ہیں۔ مفصل خط والی زبان میں گفتگو کیجیے تو تار والی زبان میں جواب دے دیتے ہیں۔ اور چہرہ پر ایسی گھبراہٹ ہوتی ہے کہ گویا کرنے والے کے لیے دعائیں کر رہے ہیں کہ یا تو یہ مر جائے اسی وقت یا اس کی زبان پر فالج گرے تا کہ کسی طرح گفتگو تو ختم ہو۔

اپنے خاص نمبروں کی سائز کے بھاری بھر کم آدمی ہیں۔ صورت سے بھولا پن برستا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چھپ چھپ کر ورزش کرتے ہیں۔ ایک ادبی رسالہ کے ایڈیٹر کے چہرہ پر جو ادبیت برسنا چاہیے اس کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ ان کو سب انسپکٹر پولیس بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ میونسپل کمشنر بھی اور جنرل مرچنٹ بھی۔

◆◆◆

حب

مہاراجکمار محمد امیر حیدر خان آف محمود آباد۔ بڑے آدمی کی بڑی بات۔ دو دو تخلص ہی رکھ لیے حب اور مسحور۔

الہ آباد میں رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کی صدارت اور خان بہادر سید ابو محمد صاحب ممبر پبلک سروس کمیشن کے اہتمام میں ایک نہایت عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا۔ میں مشاعرہ کی شرکت کے علاوہ لکھنو ریڈیو کی طرف سے بھی گیا تھا۔ تاکہ مشاعرہ وہاں سے ریلے کیا جائے۔ اس مشاعرے کی جو مخصوص نشست براڈ کاسٹنگ کے لیے ترتیب دی گئی تھی۔ اس میں ریاست محمود آباد کے راجکمار محمد امیر حیدر خاں صاحب حب بھی شریک تھے۔ نوجوان متانت اور تہذیب کا مجسمہ آداب مجلس کے گویا ماہر ہی نہیں بلکہ موجد بھی۔ میں مشاعرہ براڈ کاسٹ کرتا رہا اور چپکے چپکے مہاراج کمار کو دیکھتا رہا۔ حالانکہ دیکھنے کے لیے سر سپرو اور خواجہ حسن نظامی ایسے لوگ بھی موجود تھے۔

مہاراجکمار سے متاثر ہو کر الہ آباد سے واپس آیا۔ کچھ دنوں کے بعد لکھنو ریڈیو اسٹیشن پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ میں نے صدارت کے لیے مہاراجکمار صاحب کا نام پیش کیا۔ مجھ کو اس بات کا ذمہ دار بنا کر کہ میں مہاراجکمار کو راضی کر لوں گا۔ تجویز منظور کر لی گئی۔ مہاراجکمار کے قصر فلک بوس مبلر پیلس پہنچا۔ اطلاع کرائی۔ فوراً طلب کر لیا۔ مجسم اخلاق بن کر ملے۔ رمضان شریف کا زمانہ تھا۔ لہٰذا ذرا جھجکتا کر سگریٹ کے لیے پوچھا۔ عرض کیا کہ جی ہاں کیا مضائقہ ہے۔ سگریٹ کیس لے کر مہاراجکمار کی طرف جو بڑھا تو تبسم کے ساتھ ارشاد فرمایا ”جی روزہ“ اب بتایئے میں کیا کروں روزہ تھا تو آپ نے ایک روزہ خور سے سگریٹ کے لیے پوچھ کر اس کو کیوں بے موت مارا۔ بے حیائی کے ساتھ سگریٹ پی پی کر مہاراجکمار صاحب کو صدارت کے لیے ہموار کر لیا۔ کہنے لگے جناب آپ سے میں انکار ہی کیسے کر سکتا ہوں آپ کے والد صاحب اور میرے والد محترم میں جو تعلقات تھے۔ ان کا شاید آپ کو علم نہیں ہے۔ عرض کیا علم تو ہے مگر میں یہ دباؤ ڈالنا نہ چاہتا تھا۔ ہنس کر فرمایا بہر حال مجھ پر اسی کا اثر ہے۔ خیال یہ تھا کہ رئیس ابن رئیس ابن رئیس ہیں۔ مبلر پیلس میں رہتے ہیں۔ شطرنج یا گنجفے یا کم سے کم برج سے شغل ہو رہا ہوگا۔ ممکن ہے گانا ہو رہا ہو مگر وہاں ہو رہا تھا روزہ۔ مبلر پیلس میں رمضان شریف نظر آئے حیرت ہی تو ہو گئی۔

اب بتایئے کہ جب یہ بلند مرتبہ لوگ بھی اس طرح صوم و صلوٰۃ شروع کر دیں گے تو ہم غریب غربا آخر کیا کریں گے۔ ہائے ہماری عبادتیں بھی چھینی جا رہی ہیں یعنی ہم سگریٹ پیتے ہیں اور مہاراجکمار روزہ رکھتے ہیں۔

◆ ◆ ◆

حسرت موہانی

رئیس الاحرار مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی۔

شعر کا شعور پیدا ہونے کے بعد سے حسرت کا کلام پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اور سوچا کرتے تھے کہ حسرت کیسے ہوں گے۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کو اخباروں میں دیکھا کرتے تھے۔ زیادہ تر یہی خبریں پڑھنے کو ملتی تھیں کہ حسرت کو اتنے دن کی سزا ہو گئی۔ حسرت آج اس جیل میں ہیں کل اس جیل میں ہیں۔ گویا آپ کا صدر مقام جیل خانہ ہی تھا۔

ایک مرتبہ ہمیر پور میں ایک مشاعرہ تھا' میں لکھنو سے چلا اور کانپور سے ایک صاحب ساتھ ہو لیے۔

اجاڑ سی صورت' عینک میں ایک طرف دھجی بندھی ہوئی' میلی سی ترکی ٹوپی۔ اٹنگا سا چارخانے کا پاجامہ۔ ڈھیلی ڈھالی اچکن۔ پیروں میں میلا سا کرمچ کا جوتا۔ چیں چیں کرتی ہوئی آواز اور عجیب بھدا سا نقشہ۔ ثاقب کانپوری نے تعارف کرایا کہ آپ مولانا حسرت موہانی ہیں۔ میں تو سکتہ کے عالم میں رہ گیا۔ یا اللہ ایسے ہوتے ہیں حسرت موہانی۔

راستے میں دوستی ہو گئی۔ اس لیے کہ دشمنی کرنے کی اہلیت ان میں نہ تھی۔ وہ اپنی اسی سج دھج میں وقیع نظر آنے لگے۔ حالانکہ باتیں بھی یوں ہی سی کرتے تھے۔ کچھ عجیب کھوئی کھوئی سی اور بھی وقعت کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کہ وہ وقیع نظر آ رہے تھے۔

ایک مرتبہ ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے حسرت صاحب کی خدمت میں کانپور حاضر ہوا۔ دیکھا کہ اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک پانی سے بھرا ہوا گھڑا اٹھائے گھر میں جا رہے ہیں۔ مجھ کو دیکھ کر بھی اپنے اس کام میں مشغول رہے جب فارغ ہوئے تو ایک کھری چارپائی پر بیٹھ کر چند باتیں کیں اور جب میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا۔ ''اچھا!'' گویا نہ تمہارے آنے کی خوشی تھی نہ جانے کا غم۔ مدت تک کوشش کرتے رہے کہ مولانا حسرت اپنا کلام براڈکاسٹ کرنے پر تیار ہو جائیں مگر کسی طرح قابو ہی میں نہ آتے تھے۔ مسٹر سومناتھ چب اسٹیشن ڈائریکٹر لکھنو کی بڑی خواہش تھی کہ حسرت صاحب سے ان کا کلام براڈکاسٹ کرائیں۔ آخر ایک مرتبہ لکھنو میں مل گئے۔ میں نے ان کو تو ایک ریستوران میں بٹھا کر چاء میں مصروف کر دیا اور چپکے سے مسٹر چب کو فون کیا کہ مولانا حسرت کو پکڑ لائی ہے۔ فوراً موٹر بھیجیے۔ تھوڑی دیر میں مولانا حسرت چب صاحب کے بنگلہ پر تھے۔ اور ان سے پاکستان کے متعلق اپنے نئے فارمولا پر بحث کر رہے تھے۔ اصرار یہ تھا کہ یہ فارمولا براڈکاسٹ کر دیا جائے۔ بمشکل تمام مولانا کو اس بات پر راضی کیا کہ آپ ریڈیو اسٹیشن چلیں۔ ہم آپ سے دو ایک غزلیں

پڑھوا کر ریکارڈ کر لیں گے۔ معلوم نہیں کیوں مولانا نے کہا۔ ''اچھا' خیر'' ترقم کے ساتھ غزلیں پڑھیں اور اور جب وہ ریکارڈ سنا تو بہت خوش ہوئے۔ فرمایا ''ایں؟ یہ تو بالکل میری ہی آواز ہے تو' خیر' اب میں اسٹیشن جاتا ہوں۔'' میں اسٹیشن تک ساتھ گیا۔ میاں لطیف الرحمٰن بھی ساتھ تھے۔ حسرت صاحب نے کچھ رنگین اور رومانی افسانے بھی سنائے یعنی اپنے ذاتی رومانی افسانے اور پھر کچھ اپنا کلام بھی سنایا۔

مولانا کا سیاسی مشرب خواہ کچھ بھی ہو مگر ان کے شدید سے شدید مخالف کو بھی اس بات کا پورا یقین ہے کہ ان کی رائے ایماندارانہ اور آزاد ہوا کرتی ہے۔ ساری خدائی ایک طرف ہو جائے اور مولانا اپنی تنہا آواز بلند کئے بغیر نہیں مان سکتے۔ نہ ان کو ہوٹنگ کی پروا۔ نہ مخالفت کے طوفان سے کبھی مرعوب ہوئے جو اپنا عقیدہ ہے۔ وہ ظاہر کریں گے اور برملا ظاہر کریں گے خواہ کچھ ہو جائے۔ وہ شاعر کی حیثیت سے بلند ہیں یا لیڈر کی حیثیت سے۔ اس سلسلہ میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ شاعر پہلے ہیں اور لیڈری ان کی ثانوی حیثیت ہو سکتی ہے۔

◆ ◆ ◆

حسن نظامی، خواجہ

خواجہ صاحب کا نام معلوم نہیں کب سے کانوں میں گونجا ہوا تھا مگر دیکھا سب سے پہلے گوالیار کی بزم اردو کے اجتماع میں، جب آپ نے خضر خاں اور دیول دیوی کے متعلق اپنا وہ مقالہ پڑھا۔ جس کا تعلق گوالیار ہی کے قلعے سے تھا اور جس میں ہندو مسلم اتحاد کا فسون پھونکا گیا تھا۔

کھانے کی میز پر باقاعدہ تعارف کی رسم مشیر احمد علوی نے ادا کی۔ خواجہ صاحب بہت محبت سے ملے۔ اپنی ریلوے ٹرین نما پانوں کی ڈبیا سے پان نکال کر دیا۔ دیر تک دلچسپ گفتگو فرماتے رہے اور پھر دہلی جا کر روزنامچے میں وہ تمام گفتگو درج کر دی۔ دوسری مرتبہ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر ملا۔ پھر اسی قابل دست اندازی پولیس ڈبیا سے پان کھلایا یہ گفتگو مختصر تھی اور قہقہے زیادہ تھے۔

تیسری مرتبہ آپ سے اس طرح ملاقات ہوئی کہ آپ لکھنو ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر براڈ کاسٹ کرنے لکھنو تشریف لا رہے تھے۔ ہم لوگ آپ کے خیر مقدم کے لیے رات ہی سے یکجا ہو گئے۔ اس لیے کہ صبح پانچ بجے ٹرین آتی تھی۔ مسٹر جگل کشور مہرا اسٹیشن ڈائریکٹر، ملک حسیب احمد پروگرام ڈائریکٹر، مسٹر غلام قادر فرید، مسٹر ہنسراج لوتھرا اور میں یہ سب کے سب ایک ہی کمرے میں فرشی بستر بچا کر رات بھر سونے کے لیے جاگتے رہے۔ صبح آپ کا خیر مقدم کیا گیا اور آپ کو اسی گھر میں مہمان بنایا گیا۔

تیسری ملاقات کے بعد ہی آپ نے دہلی جا کر اپنے اخبار میں منادی میں مجھ کو ''تفریح الملک'' کے خطاب سے سرفراز کر دیا اور پھر برابر شوکت تھانوی کے بجائے مولانا تفریح الملک لکھتے رہے۔

چوتھی مرتبہ مجھے اطلاع ہوئی کہ آپ بصیغہ راز لکھنو تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ڈھونڈتا ہوا پہنچا۔ بیٹے کی سسرال میں یہ خواجہ سمدھی نظامی پلاؤ، زردہ بالائی کھا رہے تھے۔ میں بھی ہاتھ دھو کر بیٹھ گیا اور پھر خواجہ صاحب کو ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر کے لیے آمادہ کر لیا۔ اس مرتبہ خواجہ صاحب نے کچھ تجارتی معاملات بھی مجھ سے طے کئے یعنی مجھ کو حکم دیا کہ میں منادی کے لیے ''مرزا پھویا'' کا فرضی روزنامچہ لکھوں اور اس کے معاوضہ میں جو کچھ دیا جائے اس سے انکار نہ کروں۔ میں کچھ دن تک یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ آخر فرار کی ٹھانی اور چپ ہو کر بیٹھ رہا۔ اگر کچھ دن آدمی روپوش رہے تو پھر شرمندگی سنگین سے سنگین تر ہوتی جاتی ہے اور عذر گناہ کے امکانات دور ہٹتے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ اپنی کاہلی کے بدولت ایسے مشفق بزرگ ایسے چہیتے دوست اور ایسے بے غرض مہربان کو ہاتھ سے کھو بیٹھا۔ وہ بیمار رہے، میں بیقرار رہا۔ انہوں نے آنکھوں کا آپریشن کرایا اور میں نے گھنٹوں بیٹھ کر اس بات کی کوشش کی کہ ''چشم تو روشن دل ماشاد'' میں تاریخ نکل

آئے تو گمنام بھیج دوں۔ ان کے یہاں حادثات ہوئے مگر ہمت نہ ہوئی کہ تعزیت کروں اور اب تک چوروں کی طرح مفرور ہوں۔ جرم صرف اتنا ہے کہ مرزا اچھو یا لکھنا بند کیا۔ پھر اس کے بعد خط لکھنے کی ہمت نہ ہوئی اور اب خط لکھوں اور مراسم کی تجدید کروں تو کس منہ سے۔

خواجہ صاحب کا میں مرید نہیں ہوں مگر ان سے محبت ضرور کرتا ہوں۔ وہ مجھے اپنی کاکلوں اور داڑھی کے ساتھ حسین نظر آتے ہیں۔ ان میں بلا کی دلکشی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ خواجہ حسن نظامی چلتے پھرتے پوسٹر ہیں اور میں کہتا ہوں کہ حسن نظامی نہ پوسٹر ہیں نہ پیر۔ نہ ادیب ہیں نہ مقرر بلکہ وہ جادوگر ہیں۔ یقین نہ آتا ہو تو ان کے پاس جا کر دیکھیے۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے

◆◆◆

حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری سے مشاعروں کی ملاقات تھی جو رفتہ رفتہ ذاتی اور نجی ملاقات بن گئی۔

وہ خان صاحب ہیں، ابوالاثر ہیں۔ انگلینڈ ریٹرنڈ ہیں، حاجی ہیں۔ ہندوستانی اور انگریزی دونوں قسم کی بیویوں کے شوہر ہیں۔ حالانکہ صحت اور صورت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ جان ناتواں ایک چھوڑ دو بیویوں کا شوہر ہو کر کیونکر زندہ ہے اور پھر دماغی توازن اس حد تک کیونکر برقرار ہے کہ شعر بھی کہتا ہے۔ ترنم سے پڑھتا بھی ہے اور پڑھتے میں منہ چڑھا کر ایک ڈھانچے کی طرح اس طرح اکڑ بھی جاتا ہے گویا بس یونہی رہ گئے ہیں۔

جس زمانہ میں آپ لاہور سے "مخزن" نکالتے تھے اس وقت کچھ خط و کتابت ہوئی تھی اس کے بعد جب زیارت ہوئی تو یقین نہ آیا کہ یہی حفیظ جالندھری ہو سکتے ہیں جس کے نام کے ساتھ جالندھری لگا ہو اس کا توند تصور میں کس قدر بھیانک نظر آ سکتا ہے اس کا اندازہ اہل تصور ہی کر سکتے ہیں۔

خوب کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ کاش پڑھنے میں نرت اور اداکاری سے مضحک کیفیات پیدا نہ کیا کریں اور اب تو اپ نے نظم خوانی میں لیکچر بازی میں بھی شروع کر دی ہے نظم سنانے بیٹھیں گے اور لطیفے سنانا شروع کر دیں گے۔ بعض اوقات یہ لطائف نہایت پر لطف اور اوریجنل ہوتے ہیں مثلاً حیدرآباد کے ایک اجتماع میں دیر سے شاہنامہ اسلام سنا رہے تھے، یکایک آپ نے کہا۔ "حضرات آپ درود پڑھیے جب تک میں ایک سگریٹ پی لوں۔"

حفیظ صاحب جب لندن تشریف لے گئے تھے تو انگریزوں کے ایک اجتماع میں اپنا کلام بھی سنایا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ وہ انگریز آخر سمجھے کیا ہوں گے۔ کہنے لگے کہ مترجم سمجھاتا جاتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ پسند بھی کیا لیڈیز نے تمہارا کلام کہنے لگے کہ دیکھتے نہیں ہو، ولایت سے بیوی لایا ہوں۔ میں نے کہا، انگلستان بھر کی ایک غریب عورت اگر تمہارے نکاح میں آ کر چلی آئی ہے تو اس کو سند سمجھتے ہیں حالانکہ معلوم نہیں اس اجتماع کی کتنی خواتین یہ سوچ رہی ہوں گی کہ اس مرد سے شادی پہلے کی جائے یا طلاق پہلے حاصل کیا جائے۔ چلتے چلتے کھڑے ہو کر اکڑ گئے۔ معلوم ہوا کہ ہنس رہے ہیں۔

آج کل گورنمنٹ آف انڈیا میں سانگ پبلسٹی ڈائریکٹر ہیں۔ گالیاں دینے کا شوق جو خلوتوں کے لیے مخصوص تھا، اب جلوتوں میں بھی آ گیا ہے۔ ہٹلر، مسولینی اور میکاڈو کے متعلق خوب خوب گل افشانیاں کرتے رہتے ہیں۔

◆ ◆ ◆

حفیظ سید

ڈاکٹر محمد حفیظ سید الہ آباد یونیورسٹی۔

سر پر انگریزی شاعروں اور مصنفوں کی طرح کے بال یعنی چندیا صاف باقی چاروں طرف گھونگھر والے سفید بال۔ داڑھی مونچھ صاف۔ ہر اعتبار سے فارغ البال یعنی نہ بیوی نہ بچے۔ قطعاً واحد حاضر ہیں اور جمع غائب۔

فلاسفروں کی سی گمشدگی، بات بات پر چونک پڑنے کی عادت، محض ترکاریاں کھانے سے یہ حال ہے اگر گوشت بھی کھاتے ہوتے تو اب تک کئی خون کر چکے ہوتے مگر پھانسی سے ہر مرتبہ بچ جاتے۔

گوشت سے پرہیز کے معاملہ میں بڑے سے بڑا برہمن بھی آپ سے مقابلہ نہیں کر سکتا مگر ترکاریاں جس اہتمام سے کھاتے ہیں اس کے بعد گوشت کی طلب کفران نعمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ترکاریوں کے کباب، ترکاریوں کے چاپ اور ترکاریوں ہی کی بنی ہوئی ہر چیز۔ کسی مہمان کی بڑی خاطر کی تو انڈا کھلا دیا۔ آپ نے ترکاری پلاؤ ممکن ہے کہ کھایا ہو مگر حفیظ سید صاحب کے یہاں وہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

لکھنو ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ مہربان ہو گئے۔ چہرہ دیکھ کر عاقبت تک کا حال بتا دیا اور رہنمائی اپنے ذمہ لے لی۔ گھر جا کر بیوی سے ملے۔ بچوں سے ملے۔ سب کے ساتھ شفقت گویا حال ہی میں نہیں ملے ہیں۔ نسلوں سے کرم فرما چلے آ رہے ہیں۔ بچوں کی تعلیم کے متعلق ضروری ہدایات دے کر بیوی کو سمجھا کر، مجھے ڈانٹ کر چلے گئے۔ عید کے دن ایک پارسل چلا آ رہا ہے۔ بیوی کے لیے ساری اور بچوں کے لیے عید کے روپے اور میرے لیے کچھ بھی نہیں۔

باغ کے مزدور ہی اچھے رہے شداد سے

الہ آباد جا کر کسی اور کے یہاں ٹھہر جاؤ۔ آپ ناراض، بیوی کو شکایت لکھی جا رہی ہے کہ تمہارا شوہر آوارہ ہو رہا ہے۔ آپ کے یہاں ٹھہرو تو دن رات نصیحتیں سنو۔ یا زیادہ سے زیادہ ریڈیو سن لو۔ آپ خود ہو گا۔ ورزش کریں گے۔ ترکاریاں کھائیں گے۔ امتحان کی کاپیاں دیکھیں گے۔

حفیظ سید صاحب سے مل کر یہ اندازہ تو ضرور ہوا ہے کہ ان میں سب کے لیے نہیں مگر جس کے لیے خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔ بس اس کی جان کو آ جاتے ہیں۔ کھلاتے سونے کا نوالہ اور دیکھتے شیر کی نگاہ ہیں۔ ہائے یہ محبت اس نسل کے بعد کہاں ملے گی۔

◆ ◆ ◆

خلیل احمد

سید خلیل احمد صاحب سیکرٹری ایک آنہ فنڈ لکھنو۔

لکھنو میں ایک انجمن ہے جس کا نام ''انجمن عالیہ ایک آنہ فنڈ'' ہے۔ اس انجمن کا کا کام ہے۔ مسجدوں کی تعمیر و مرمت' بچوں کی تعلیم' یتیموں اور بیواؤں کی امداد وغیرہ۔ اس انجمن کے بانی اور منتظم اعلیٰ سید خلیل احمد صاحب ہیں۔ جن کا تخلص ہے ''غمزدہ'' تخلص ذرا بڑا ضرور ہے مگر اتنا بڑا آدمی اس سے بھی چھوٹا تخلص کیا رکھتا۔

موٹے تازے لمبے تڑنگے آدمی ہیں۔ داڑھی قد سے کچھ ہی چھوٹی ہوگی۔ سر سید کی داڑھی یاد آ جاتی ہے مگر اب تو اسے بھی لوگ بھولنے لگے ہیں۔

آپ کے زیر اہتمام اور نسیم انہونوی کی ادارت میں رسالہ انکشاف نکلتا تھا۔ میں اس زمانہ میں روزنامہ ''ہمدم'' کے عملہ ادارت میں تھا۔ نسیم صاحب نے وہیں سے مجھے گرفتار کیا تھا۔ دفتر رسالہ انکشاف ایک آنہ فنڈ کے دفتر میں تھا۔ لہٰذا سید خلیل احمد صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کی عجیب وغریب شخصیت کا اندازہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوا۔ مثلاً ان کا کوئی خط آیا۔ لفافہ پر ''برکار سرکار'' کی طرح لکھا ہوتا تھا ''بکار احکم الحاکمین خداوند تعالیٰ'' سمجھے کہ موت کا پروانہ آ گیا ہے مگر ہوتا تھا وہ دعوت کا رقعہ یا چندے کا بل۔ آپ کے دفتر میں جہاں چھوٹے چھوٹے بڑے بہت سے سائن بورڈ ہیں وہاں پاخانہ پر بھی ایک سائن بورڈ لگا ہے۔ ''صحت خانہ'' لوگ اسپتال سمجھ کر جاتے ہیں مگر حاجت پوری ہو جاتی ہے۔

مشاعروں میں اپنا کلام اس طرح سناتے ہیں گویا کوئی نئی نویلی دلہن بہت اصرار پر سسرال کے واقعات سنا رہی ہے مگر یہی شرم تو مومن کی خاص پہچان ہے اور خلیل احمد صاحب کچھ ہوں یا نہ ہوں مگر مومن تو ضرور ہیں۔

◆ ◆ ◆

خمار بارہ بنکوی

رفیع احمد خان صاحب کے یہاں ایک بالکل نوخیز صاحبزادے کو دیکھا جو اپنا کلام سنا رہے تھے۔ آواز بڑی سریلی تھی۔ لہٰذا دلچسپی سے سننے بیٹھ گئے۔ غور کیا تو کلام بھی خوب تھا۔ ہر چند کہ جگر سے اس قدر متاثر نظر آتے تھے کہ وہی ترکیبیں، وہی جوڑ توڑ اور وہی تمام بندشیں مگر پھر بھی تقلید حسین ضرور تھی۔ معلوم ہوا کہ آپ خمارہ بارہ بنکوی ہیں۔ پھر اس کے بعد مشاعروں میں ملنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی اور مجھ پر خاص کرم فرمانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی اور مجھ پر خاص کرم فرمانے لگے۔ خاص سے مراد یہ ہے کہ میرے لیے بارہ بنکی سے رسادل کی ہانڈیاں لانے لگے۔

خمار ابھی بچہ ہیں۔ ان کا مستقبل مجھے تو بہت شاندار نظر آ رہا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے لیے خود کوئی راستہ نکالیں۔ جگر کی تقلید ایک ماہر فن کی تقلید ضرور ہے مگر خمار اپنی انفرادیت کے لیے اگر ابھی سے جستجو شروع کر دیں تو زیادہ اچھا ہے۔

◆◆◆

دیا نرائن نگم

رائے صاحب منشی دیا نرائن، مشہور ادبی رسالہ "زمانہ" کے ایڈیٹر۔

رسالہ زمانہ ادبی حلقوں میں نہایت وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور منشی دیا نرائن نگم اس رسالہ کو اپنے دم کے ساتھ چلاتے رہے۔ دھان پان، سینک سلائی قسم کے باوضع آدمی تھے۔ چوڑی دار پاجامے اور شیروانی میں بھی اتنے دبلے نظر آتے تھے کہ لباس کے اوپر سے ایک ایک پسلی گنی جا سکتی تھی۔

میں متعدد بار نگم صاحب سے ملا۔ کانپور میں ان کے یہاں دعوتیں کھائیں۔ لکھنو میں ان کو اپنے یہاں چائے پلائی مگر رسمی تعلقات پھر بھی رسمی ہی رہے۔ نگم صاحب بہت خوش اخلاق، بذلہ سنج اور ہنس مکھ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ لیے دیے رہتے تھے اور میں بھی اتنا لیے دیے رہا کہ وہ بیچارے ہمیشہ شاکی رہے مگر مجھ پر نہ جانے کیا مار تھی کہ زمانے کے لیے کبھی کچھ نہ لکھا۔ ہر مرتبہ وعدہ کیا اور ہر مرتبہ وعدہ خلافی۔ یہاں تک کہ نگم صاحب اس دنیا سے چل بسے اور یہ وعدہ فراموش اب تک زندہ ہے اور مرنے والے سے شرمسار۔

◆◆◆

دیوانہ بریلوی

بریلی کی رعایت سے دیوانہ اور دیوانہ کی رعایت سے بریلی بہت خوب ہے۔ مگر یہ بکارِ خویش ہوشیار دیوانہ کانپور کے ویرانے میں نہیں بلکہ آبادی میں آباد ہے۔ اسمِ گرامی ہے خان قدرت اللہ خاں۔ اور اللہ کی قدرت یہ ہے کہ واقعی چہرہ سے دیوانگی نہیں ہوش ہی ہوش۔ فراست ہی فراست برستی ہے۔ تخلص کی ضرورت اب تک سمجھ میں نہ آئی اس لیے کہ دیوانہ صاحب شاعر کی حیثیت سے نہیں افسانہ نگار کی حیثیت سے دنیائے ادب میں تشریف لائے تھے اور اب تک تشریف فرما ہیں۔ افسانوں میں مقطع تو ہوا نہیں کرتا۔ پھر معلوم نہیں کیوں آپ بیٹھے بٹھائے دیوانہ بن گئے۔

نسیم صاحب انہونوی کے رسالہ ''انکشاف'' نے لکھنے والوں کا جو طبقہ پیدا کیا تھا اسی میں کانپور کے چار بزرگ تھے۔ خان قدرت اللہ خان دیوانہ بریلوی' لیاقت اللہ خان نظر بریلوی' شمیم بلہوری' سلیم ندوروی۔ نسیم صاحب ہی کے ساتھ کانپور میں ان حضرات سے نیاز حاصل ہوا تھا اور ان سب میں میری نظر انتخاب کا قرعہ فال اسی دیوانہ کے نام نکلا تھا۔ یہ شخص مجھے افسانہ نگار نہیں خود افسانہ نظر آیا۔ نفاست اور جامہ زیبی کی مکمل تصویر۔ بات بات میں سلیقہ اور تمیز داری۔ گھر کا ایک ایک گوشہ آرٹ کا ایک مکمل نمونہ' حد یہ ہے کہ دیوانہ صاحب روزانہ شیو کرتے ہوئے اپنی مونچھوں پر جو آرٹ ختم کرتے ہیں اسی کو بس دیکھا کیجئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لکھتے کس وقت ہیں۔ گھر کی صفائی کس وقت کرتے ہیں۔ میونسپلٹی کی نوکری کس وقت فرماتے ہیں اور پھر اپنا ذاتی مکان کس وقت بنواتے ہیں۔ مگر اب عرصہ سے لکھنا بند کر دیا ہے۔ غالباً مکان بنوانے کا مشغلہ زیادہ پسند آیا۔

خاموش لطیفہ گو' سنجیدہ مضحک' سرمایہ دار غریب' نازک اندام پٹھان' مختصر یہ کہ آپ اسی قسم کی بہت سی متضاد کیفیات کا مجموعہ واقع ہوئے ہیں اور یہی تضاد آپ کی کامیاب ناکامیوں کا راز ہے۔

◆◆◆

دیوانہ گورکھپوری

مولوی محمد فاروق صاحب دیوانہ ایم ایل اے۔

اگر آپ بھی دیوانہ ہیں تو خدا کی قسم دنیا میں کوئی ہوشیار نہیں ہے۔

گورکھپور کے ایک مشاعرے میں مجنوں صاحب گورکھپوری نے اپنے ہی قد و قامت کے ایک بزرگ سے تعارف کرایا کہ "والد صاحب سے ملئے" معلوم ہوا کہ مجنوں صاحب کے والد محترم کا تخلص ہے 'دیوانہ۔ ہم نے ریلوے کو گالیاں دینا شروع کر دیں کہ گورکھپور کی جگہ مجد پہنچا دیا۔ مگر مجنوں اور دیوانہ کو دیکھ دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ کسی چھوٹی بحر کے دو مصرعے ہیں اور کس قدر برابر۔

اب دیوانہ صاحب سے گفتگو شروع ہوئی۔ بے پروائی حیرت میں۔ حیرت مسرت میں مسرت محبت میں اور محبت عظمت میں گم ہو کر رہ گئی۔ اللہ اکبر۔ اس قدر مختصر سے جسم میں اس بلا کی ہمہ گیر ذہانت۔ صرف ذہانت ہی نہیں ٹھوس معلومات تھوڑی تک تو معلوم ہوا کہ آدمی سے باتیں کر رہے ہیں۔ پھر محویت اتنی بڑھی کہ سمجھ بیٹھے کہ انسائیکلو پیڈیا کے کسی پاکٹ ایڈیشن کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ جس موضوع پر گفتگو کیجئے۔ دیوانہ صاحب کوئی دور کی کوڑی ضرور لائیں گے۔ ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اپنی بساط کے مطابق ڈنڈا۔ کندھے پر پڑا ہوا کمبل اور دماغ میں علوم و فنون کے خزانے جن کو زبان لٹاتی چلی جاتی ہے۔

آپ گورکھپوری کے مشہور رئیس میاں جواد علی شاہ صاحب والی امباڑہ اسٹیٹ کے مینجر تھے۔ جب اس خاکسار سے پہلی مرتبہ ملے اسی وقت سے شفقت کا یہ عالم تھا کہ گویا آپ رسماً نہیں اخلاقاً نہیں بلکہ واقعی ہمارے بزرگ ہیں یعنی ہم نے سنجیدگی کے ساتھ دیوانہ صاحب سے مرعوب ہونا شروع کر دیا تھا۔ ان کی دیوانگی سے نہیں ان کے ہوش سے' ان کے تبحر سے اور ان کی صاف گوئی سے۔

دیوانہ صاحب ہمدرد کے مشہور حاجی بغلول رہ چکے ہیں اور اب وہ یو پی' اسمبلی کے نہایت بیباک ممبر ہیں۔ ہم اب تک جھک کر سلام کرتے ہیں اور وہ اب تک بغل میں ڈنڈا دبا کر گلے سے لگا لیتے ہیں۔

◆◆◆

ذوقی

خواجہ مسعود علی ذوقی علیگ!

سب سے پہلے گورکھپور میں مولانا سیماب اور حضرت ساغر کے ہمراہ وصل صاحب بلگرامی کے یہاں ملے تھے۔ سگار پی کر دھواں اس طرح اڑا رہے تھے' گویا "عالم تمام حلقہ دود سگار ہے" میں نے ڈر ڈر کر تعارف حاصل کیا کہ کہیں اس گستاخی پر بھی سگار نہ پینے لگیں۔ واجبی سی بات چیت ہوئی۔ پھر رسالہ پیمانہ میں ایک عورت کے متعلق آپ کی ایک نظم پڑھی۔

بہت دلچسپ ہے ترے سکوت ناز کا منظر
نگاہیں گفتگو کرتی ہیں تو خاموش رہتی ہیں

نظم پڑھ کر معلوم ہوا کہ لفظ "ذوق" کو شیخ محمد ابراہیم نے جس قدر بے کیف بنایا تھا' آپ اس کی تلافی کر رہے ہیں۔ پھر جب علی گڑھ کی جوبلی میں ملاقات ہوئی وہ ذرا تفصیلی تھی مگر آپ مشاعرے کی سیکرٹری شپ میں مبتلا تھے اور ہم سب آپ کے تیماردار' آخر لکھنو میں' گونڈہ میں اور نہ معلوم کہاں کہاں آپ ملتے رہے اور یہ راز کھلتا رہا کہ یہ تو اپنے ہی ڈھب کے آدمی ہیں۔ اعلیٰ درجے کے صاحب ذوق ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے اداکار بھی ہیں۔ حال ہی فضلی برادرز نے مشاعرہ کی ایک تمثیل فلمبند کی ہے۔ اس میں اس ذوقی نے ذوق کا کردار پیش کیا ہے مگر یہ تو صرف ایک کردار تھا جو آپ پردہ سیمیں پر پیش کر سکے۔ ورنہ واقعہ تو یہ ہے کہ خواجہ مسعود علی ذوقی کو گونڈہ کے ایک ہائی سکول میں اسسٹنٹ ماسٹر ہونے کی بجائے ہالی ووڈ میں ہونا چاہیے تھا۔

نہایت شستہ ظرافت' نہایت شگفتہ بات چیت۔ بڑے آدمیوں کی سی باتیں مغربی طرز کی ہندوستانی زندگی۔ حد یہ ہے کہ اگر گھر پر ڈریس گون نہ پہنیں تو اپنے کو برہنہ سمجھتے ہیں۔ پہلے تو پان بھی نہیں کھاتے تھے مگر اب ہندوستانی ہو گئے ہیں۔

شعر اس طرح پڑھتے ہیں گویا عدالت میں جرح کر رہے ہیں۔ چہرہ پر ترنم برستا ہے مگر منہ سے نہیں پھوٹتا۔ دوہرا جسم ہے جو فی الحال تو برا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اگر ورزش چھوڑ دی تو مولانا سیماب بن جائیں گے۔

◆ ◆ ◆

راز چاندپوری

ادبی رسائل میں آپ کا کلام کثرت سے پڑھا جاتا تھا۔ خصوصاً پیمانہ میں آپ پر پابندی سے لکھتے رہتے تھے۔ ساغر صاحب سے آپ کے تذکرے سنے تھے۔ آخر کانپور کے ایک مشاعرہ میں آپ معہ اپنی چھوٹی سی داڑھی اور روپہلی عینک کے نظر آگئے۔ جوانی میں وہ بلا کی سنجیدگی تھی کہ خدا شباب کو اس قسم کی سنجیدگی سے محفوظ رکھے۔ اس قسم کی سنجیدگی بڑھاپے تک پہنچ کر بن جایا کرتی ہے۔ لطیفہ کہیں گے تو وہ بھی بغیر ہنسے ہوئے، لطیفہ سنیں گے تو وہ بھی اس طرح کہ سنانے والے کا خودکشی کو دل چاہنے لگے مگر اس خاموشی میں بھی خلوص اور صداقت خاموشی کے ساتھ کارفرما نظر آئی۔ چھوٹی سی حیثیت اور بہت بڑے دل کے آدمی ثابت ہوئے۔ زندگی ایک مقررہ اصول پر بسر کرتے ہوئے پائے گئے۔ کانپور میں جب تک رہے، کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہی۔ جب سے جبلپور گئے ہیں نہ ان کو ہماری خبر ہے نہ ہم کو ان کی۔ وہ اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر، ان کی اس فراموش کاری سے ناخوش۔

◆◆◆

راشد

ن م راشد، جدید شاعری کے مشہور شاعر، ماورا کے قابل ذکر مصنف۔

آپ کی آزاد شاعری کو عرصہ تک حیرت سے پڑھتے رہے۔ اعتراض اور اعتراف کی کشمکش میں مبتلا ہی تھے کہ بھوپال میں ملاقات ہو گئی۔ ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کی سالگرہ کے موقع پر جو مشاعرہ ہوتا تھا۔ اسکول آف انڈیا ریڈیو ریلے کرتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ راشد صاحب اسی سلسلہ میں دہلی سے آئے ہوئے تھے۔ مشاعرے کی شرکت ان کا مقصد نہ تھا اور سچ پوچھئے تو اس مشاعرے سے ان کا سروکار ہی کیا ہو سکتا تھا۔ یہاں ردیف تھی، قافیہ تھا، بحر تھی اور ان کی شاعری ردیف اور قافیہ کے علاوہ کسی مقررہ بحر کی بھی مشکل ہی سے تاب لاتی ہے۔ البتہ تخیل اور فکر کی پوری گہرائیاں موجود ہوتی ہیں۔

راشد صاحب صورتاً قطعاً شاعر نہیں ہیں۔ ایک اجنبی ان کو دیکھ کر یہی کہہ سکتا ہے کہ ان کے پاس لوقا کی انجیل اور متی کی انجیل کے نسخے فروخت کے لیے موجود ہوں گے یا شاید یہ طاعون کا ٹیکہ لگانے والے ڈاکٹر ہیں مگر جب راشد صاحب گفتگو کرتے ہیں تو شاعر نظر آنے لگتے ہیں۔ بے تکلفی کا موقع نہیں ملا۔ خدا جانے اپنے خاص حلقہ کے لوگوں میں کس نظر سے دیکھے جاتے ہوں گے مگر ہم کو تو سرسری طور پر کچھ لیے دیئے سے کچھ ضدی سے کچھ سرکش سے اور کچھ ترقی پسند مصنف سے نظر آتے ہیں اگر گورنمنٹ سرونٹ نہ ہوتے تو باغی ہوتے یعنی ریڈیو مین نہ ہوتے تو جیل میں ہونے کے امکانات تھے۔

◆◆◆

رام بابو سکسینہ

رائے بہادر رام بابو سکسینہ مولف ہسٹری آف اردو لٹریچر۔

آپ نے اردو کی ایک مبسوط تاریخ لکھی ہے مگر انگریزی میں۔ گویا کھچڑی تو تناول فرمائی ہے مگر چھری کانٹے سے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ آپ نے یہ بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ راستہ غلط سہی مگر منزل ضرور سر کی ہے۔ میں رام بابو صاحب سے اس وقت ملا تھا جب آپ یو پی انفارمیشن کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے لکھنو میں تعینات تھے۔ صورت شکل، طرز گفتگو اور ہر ادا سے ادبی آدمی تو نہیں۔ البتہ ڈپٹی کلکٹر ضرور معلوم ہوتے تھے۔ ڈپٹی کلکٹری آپ کی ادبیت پر غالب تھی۔ لہذا اپنے ڈپٹی کلکٹرانہ انداز کے ساتھ اپنی ادبی خدمات کے تذکرے خوب کرتے تھے۔ آپ نے ایک تصویر دکھائی جو گول میز کانفرنس کی تھی۔ ایک کونہ میں ایک دھندلا سا عکس تھا۔ صورت صاف نظر نہ آتی تھی۔ فرمایا کہ یہ میں ہوں۔ ہم نے مسرت کا اظہار کر دیا اور ان کے حسب منشا مرعوب بھی ہو گئے۔ حال ہی میں سر تیج بہادر سپرو کے یہاں ملاقات ہوئی۔ فرمایا کہ میں ہسٹری آف اردو لٹریچر کا دوسرا حصہ لکھ رہا ہوں۔ جس میں اس وقت تک کے تمام ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ہوگا۔ معلوم نہیں وہ لکھ چکے یا نہیں۔ بہر حال یہاں ان کا یہ تذکرہ تیار ہے۔ جس کو پڑھ کر سگریٹ منہ میں دبائے دبائے فرمائیں گے۔ ''یہ مزاحیہ رنگ میں ہے لہذا دلچسپی پیدا کرنے کے لیے میرا خاکہ دانستہ طور پر غلط کھینچا گیا ہے۔'' حالانکہ اول تو خاکہ غلط نہیں ہے۔ اور اگر کوئی غلطی ہوئی بھی ہے تو وہ دانستہ نہیں ہے نادانستہ ہے۔

◆ ◆ ◆

رام لال ورما

روزنامہ تیج دہلی کے لاغر اندام مدیر اعلیٰ۔ آپ سے لکھنو میں اس وقت نیاز حاصل ہوا تھا جب آپ اپنا ذاتی اخبار روزنامہ ہند نکالنے لکھنو تشریف لائے تھے اور اس کے عملہ ادارت میں مجھے شامل کرنے کے لیے روزنامہ اودھ اخبار چھوڑ کر ہند میں آیا۔ ہند اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبا۔ ورما صاحب ایک سکبسار کی حیثیت سے اس غرقابی کا تماشہ دیکھتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ آپ پھر روزنامہ تیج دہلی کی ادارت فرما رہے ہیں۔ گویا ہند تو محض اس لیے نکالا گیا تھا کہ ہم کو اودھ اخبار سے نکال کر خانماں برباد کر دیا جائے۔

ورما صاحب نہایت سلجھی ہوئی طبیعت کے بظاہر خود اپنے معاملات میں الجھے ہوئے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ بات اس طرح کرتے ہیں گویا ٹائیفائڈ سے ابھی اٹھے ہیں اور پرہیز کرتے کرتے زندگی سے عاجز آ چکے ہیں۔ اپنے زرد رنگ کے پارکر قلم سے قوم پرورانہ لیڈنگ آرٹیکل خوب لکھتے ہیں۔ لیکن اگر قلم میں روشنائی ولایتی نہ ہو تو سودیشی کے ترویج کے مضامین مشکل ہی سے لکھ سکتے ہیں۔ عمر گو کافی ہے مگر صورت سے لڑکپن برستا ہے حالانکہ سنجیدگی اس صورت پر زیب نہیں دیتی مگر رہتے عام طور پر سنجیدہ ہی ہیں اور ہنستے محض بقدر ضرورت ہیں۔

◆◆◆

رحم علی الہاشمی

چوہدری رحم علی الہاشمی....... آپ بے شمار اردو اور انگریزی روزناموں کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ بلکہ آپ کو صحافت میں ملک الموت کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے۔ خدا جانے کتنے اخباروں کی روح قبض کی ہے۔ صرف اخباروں کو مارا ہی نہیں جلایا بھی ہے۔ مگر دنیا کو جلانا تو یاد نہیں رہا۔ مارنا یاد رہ گیا۔

سید جالب دہلوی مرحوم کے بعد ہمدم کی ادارت آپ نے فرمائی تھی اور اسی سلسلہ سے مجھ کو آپ سے قرب حاصل ہوا تھا جو رفتہ رفتہ عزیزدارانہ مراسم کی حد تک بڑھ گیا۔ ہاشمی صاحب صحافی ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہیں۔ عزیز لکھنوی کے خاص شاگرد رہ چکے ہیں۔ اتنے خاص کہ عزیز مرحوم کے مجموعہ کلام گلکدہ پر آپ ہی نے مقدمہ لکھا ہے۔

چھوٹی چھوٹی مونچھیں ہیں جو لبوں پر چھپر کی طرح چھائی رہتی ہیں اور آپ کا ایک ہاتھ ان کو سنوارنے اور بگاڑنے میں مصروف رہتا ہے۔ ترکی ٹوپی، شیروانی، چوڑی دار پاجامہ اور ڈوری دار جوتا پہن کر آپ ہر وقت ہنستے رہتے ہیں۔ البتہ بیگم صاحبہ کے قریب پہنچ کر یہ قہقہے کچھ تھرائے ہوئے سے، سہمے ہوئے سے اور آپ خود کچھ سکڑے ہوئے سے نظر آنے لگتے ہیں۔ قابلیت ذہانت کے حضور پہنچ کر شپٹا جاتی ہے۔ بیگم رحم علی ہاشمی نے بلا کا ذہن پایا ہے اور قیامت کی حاضر جواب ہیں۔ ہاشمی صاحب ہر چند کہ اقرار نہیں کرتے مگر ڈرتے ضرور ہیں۔ میں بیگم صاحبہ کو آپا کہتا ہوں اور وہ مجھے اس شفقت سے کہتی ہیں کہ واقعی آپا معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ہاشمی صاحب کے خلاف ہم دونوں بہن بھائی مل کر عجیب عجیب سازشیں کیا کرتے ہیں۔ گھاس بھرے ہوئے سنبوسے کھلا دیئے۔ ان کے اشعار پر تنقید شروع کر دی۔ مختصر یہ کہ ان کو جب چاہا، رلا رلا دیا۔ وہ رونی ہنسی ہنستے میں اور ہم دونوں ان کی اس ہنسی سے قلبی مسرت حاصل کرتے ہیں۔ بیگم رحم علی ہاشمی میرے لیے سندیلے کے خاص بٹوے بناتی ہیں۔ جن پر ہاشمی صاحب اس طرح فخر کرتے ہیں گویا یہ آپ ہی کی صنعت ہے۔ صناع بیوی کے شوہر کو حق ضرور ہے مگر اتنا نہیں جتنا ہاشمی صاحب کرتے ہیں۔

◆ ◆ ◆

رشید احمد صدیقی

پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

سب سے پہلے حضرت اصغر گونڈوی کے ساتھ آپ سے لکھنو میڈیکل کالج میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ جہاں یورپین وارڈ میں ایک گروہ نکلوانے کے بعد اس طرح اطمینان سے بستر علالت پر دراز تھے گویا گروہ کھو کر زندگی پا لینے سے اپنے کو گھاٹے میں نہیں سمجھتے۔ صورت دیکھ کر یقین نہ آیا کہ یہی وہ رشید صدیقی ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کے بعد جب دنیائے تبسم پر مقدمہ لکھوانے علی گڑھ گیا۔ اس وقت بھی چہرہ سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ مرثیہ ممکن ہے اچھا کہتے ہوں مگر مزاح نگار آخر یہ کیونکر ہو سکتے ہیں۔ لیکن چہرہ کی اس غیر شگفتگی کے باوجود قلم میں زندگی اور شگفتگی بلا کی ہے۔ میں نے ہمیشہ بحیثیت ایک مزاح نگار کے ان کی عظمتوں کا اعتراف کیا ہے البتہ میں ان کی بعض تنقیدوں اور تنقیدی فیصلوں سے اختلاف ضرور رکھتا ہوں مثلاً خود میرے تعلق ان کا یہ فیصلہ کہ مجھ میں اور ملا رموزی میں بہت کم فرق ہے کسی طرح خود رشید صاحب کے ایسے بلند پایہ مزاح نگار اور ناقد کے شایان شان نہیں سمجھتا یا تو انہوں نے مجھ کو سمجھنے میں غلطی کی ہے یا ملا رموزی کو غلط پڑھا ہے۔

رشید صاحب کے مزاح میں فلسفہ زیادہ ہوتا ہے یا علی گڑھ زیادہ۔ عام باتیں زیادہ ہوتی ہیں یا ان کے خاص احباب زیادہ۔ اس کے متعلق غالباً خود ان کی رائے یہ ہوگی کہ علی گڑھ اور احباب کو ان کے مزاح میں زیادہ دخل ہے۔ مگر اس کے باوجود لطف سب ہی کو حاصل ہوتا ہے اور ان سب میں خود میں بھی شامل ہوں۔

◆◆◆

رشید جہاں

ڈاکٹر رشید جہاں مصنفہ ''انگارہ وعورت'' وغیرہ

ڈاکٹر رشید جہاں ترقی پسند مصنفین کی صف اول میں نظر آتی ہیں۔ ان کے مضامین تو بہت پہلے میری نظر سے گزر چکے تھے مگر وہ خود لکھنو ریڈیو اسٹیشن پر مجھے نظر آئیں۔

سادہ اور بے تکلف' منہ پھٹ اور لڑاکا' خود اعتمادی میں سب سے آگے اور قابل ہو جانے پر اپنی غلطی تسلیم کر لینے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ چہرہ پر ایک رعب' دوسرے کو مرعوب کر دینے والی دبنگ بات چیت۔ بڑے بڑے مسائل پر اپنی ایک مضبوط رائے رکھنے والی خاتون۔

ساری دنیا کی آپ آپا ہیں۔ سوائے ان چند لوگوں کے جو کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے آپا نہ کہہ سکتے ہوں۔ بہر حال میں خود رشید آپا کہتا ہوں اور ان سے تو آج تک نہیں کہا مگر واقعہ یہ ہے کہ ڈرتا ہوں۔ ان کی عزت اور ان کے آرٹ کی عظمت میرے دل میں اس ڈر کے باوجود ہے۔

لکھنو ریڈیو اسٹیشن سے آپ کا ایک ڈرامہ نشر ہو رہا تھا ''گوشہ عافیت'' اس ڈرامہ میں ایک بہری خالہ کا بھی کردار تھا۔ رشیدہ آپا نے بہت سی خواتین کو اس پارٹ کے لیے آزمایا۔ آخر اس خاکسار کو حکم ملا کہ تم یہ پارٹ کرو۔ مرد ہو کر عورت کا پارٹ؟ مگر رشیدہ آپا کا حکم تھا' نادری حکم' لہذا خالہ بننا پڑا۔ بوڑھی اور بہری خالہ۔ کاش میں رشیدہ آپا سے نہ ڈرتا ہوتا۔

ڈاکٹر رشیدہ جہاں سوشلسٹ اعتقادات پر ایمانداری سے قائم ہیں۔ اس اعتقاد نے ان کو ایثار' نفس کشی اور بہادری کے کچھ راز ایسے سمجھا دیے ہیں کہ ہندوستان کی یہ خاتون روس کی سرخ فوج میں مردوں کے دوش بدوش اکڑ کر کھڑی ہو سکتی ہے اور کیا مجال کہ کوئی دیکھ کر یہ پہچان بھی لے کہ اس صف میں بہادر سپاہیوں کے علاوہ کوئی اور بھی ہے۔

◆◆◆

رضا لکھنوی

سید آل رضا ایڈووکیٹ سیکرٹری انجمن بہار ادب لکھنو۔

مشاعرے میں ایک دولہا میاں نظر آئے۔ مخمل کی پھولدار شیروانی۔ اسی کپڑے کی کشتی نما ٹوپی۔ اسی کپڑے کی دلائی۔ ریشمی موزے۔ چوڑی دار پاجامہ۔ ہاتھ میں ریشمی رومال۔ گوراچٹا رنگ۔ چال میں ایک خاص پامالی۔ اداؤں میں بلا کی عروسیت۔ گفتگو کرنے میں ''الف دوز بران دوزیران دوپیش ان'' کی سی کیفیت۔ کلام پڑھنے میں ریشمی رومال اور ہاتھ کے انگوٹھے میں ''اختو بختوŒ والا ربط اور شعر کے آخر تک پہنچتے پہنچتے چہرہ پر انتہائی کرب کے پورے آثار' معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے شعر نہیں پڑھا ہے۔ اپنے کلیجہ میں چھپا ہوا ایک تیر بمشکل تمام نکالا ہے۔ اور سامعین کے سامنے پیش کر کے خود بیہوش ہو گیا ہے۔ جی چاہا کہ ترس کھا کر شعر پڑھنے سے منع کر دیں۔ معلوم ہوا کہ آپ سید آل رضا ہیں۔ آخر کار شاعر کے علاوہ انسان کی حیثیت سے بھی آپ سے ملے۔ قریب سے آپ کو دیکھا۔ محبت کرنے والا دل۔ گھل مل جانے والا اخلاق اور دل لبھا لینے والی ادائیں رکھتے ہیں۔ خیریت یہ ہوئی کہ رضا صاحب مرد ہیں ورنہ خود رضا صاحب کو نہیں معلوم کہ....... ''خدا جانے یہ دنیا پھر بھی ہوتی یا نہیں ہوتی''

خوب کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ کلام میں وہی درد ہی درد ہے۔ کبھی کبھی چپکے چپکے سے شوخی بھی کر جاتے ہیں۔ اگر وکالت نہ کرتے ہوتے تو مولانا صفی کے حریف ہوتے یا شاعری نہ کرتے ہوئے وکالت میں ڈاکٹر کاٹجو اور سر سپرو سے سے الجھے رہتے۔

◆ ◆ ◆

رفیع احمد خان

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

رفیع احمد خان ایم اے، مجھ سے اس قدر قریب ہیں کہ میں ان کو دیکھنے سے قاصر ہوں۔ ان کے معائب محاسن اور محاسن معائب نظر آتے ہیں۔ مثلاً ان کی ذہانت، ان کے تبحر اور ان کی بلا کی حاضر جوابی پر غصہ آتا ہے کہ یہ شخص اتنا بلند ہو کر اس پستی میں زندہ رہنا کیوں گوارا کئے ہوئے ہے۔ خودکشی کیوں نہیں کر لیتا۔ کسی کو قتل کر کے پھانسی پر کیوں نہیں چڑھ جاتا۔ لڑائی میں جا کر رنگروٹ کیوں نہیں بن جاتا۔ کواپریٹو سوسائٹیز میں ہیڈ اسسٹنٹ کیوں بنا ہوا ہے۔ ان کے چاندنی اور اندھیری راتوں کے مشاغل پر دل خوش ہوتا ہے کہ ضرور اس مظلوم کو فطرت سے اسی طرح انتقام لینا چاہیے۔ فطرت اس کو پیس ڈالنا چاہتی ہے۔ مگر وہ ٹھٹھے لگاتا ہے۔ قہقہے بلند کرتا ہے۔ تقدیر کو منہ چڑھاتا ہے اور منہ چڑھا چڑھا کر ایک شریر لڑکے کی طرح دور جا جا کر ہنستا ہے۔ پھر منہ چڑھاتا ہے اور پھر دور بھاگ کر ہنستا ہے۔

میں نے بہت سے ذہین آدمی دیکھے ہیں۔ بہت سے پڑھے لکھے جاہلوں اور عالموں سے سابقہ رہا ہے۔ بڑے بڑے حاضر جوابوں کے کمالات دیکھ چکا ہوں مگر رفیع احمد خان اپنا جواب خود ہیں۔ انگریزی میں ایک تبحر صاحب قلم۔ اردو میں ایک جادو بیان شاعر۔ جادو یہ ہے کہ کلام نظر نہیں آتا۔ مگر خدا کی قسم بے پناہ کہتے ہیں۔ ایسا کہتے ہیں کہ خود ان کا ایک شعر سن کر علامہ اقبال نے مجھ سے کہا تھا کہ خیریت یہ ہوئی کہ یہ شخص اپنے مخصوص رنگ میں اپنی ذہانت صرف کر رہا ہے۔ اگر سنجیدگی کی طرف مائل ہو جاتا تو بہت سے شاعروں کا پتہ نہ چلتا کہ کیا ہوئے۔ نقاد اس قیامت کا کہ بڑے بڑے لوہا مانتے ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی کے پہلے دیوان کے مقدمہ نگار رفیع احمد خان ہی ہیں۔

زندگی کا صرف ایک اصول ہے یعنی بے اصولی۔ نہ کوئی سونے کا وقت نہ بیداری کا کوئی پروگرام تاش کھیلنے بیٹھے تو دو دو دن شب و روز جمے ہوئے ہیں۔ پیر میں گاؤٹ کا درد ہے، کباب کھا رہے ہیں اور تاش بانٹ رہے ہیں۔ بخار میں ہانپ رہے ہیں مگر مصرع طرح دے دیجئے۔

پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار

ایک ایک قہقہہ بردوش، توبہ کرا دینے والا شعر استادی کے سانچے میں ڈھلا ہوا سننے کو مل جائے گا۔ یہ اشعار کہیں لکھے نہیں جاتے۔ نہ چھپ سکتے ہیں۔ نہ باتکلف لوگوں کو سنائے جا سکتے ہیں مگر علم سینہ بن کر حافظوں میں محفوظ رہ جاتے ہیں اور بڑے بڑے شاعر ان ہی

شرمناک اشعار کو اپنے نام سے منسوب کر کے لوگوں کو سناتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے۔

میں ان کا عزیز ترین دوست ہوں' بے حد گستاخ اور بے حد تکلف' لوگ کہتے ہیں کہ رفیع احمد خان کی تکیل شوکت کے ہاتھ میں ہے اور رفیع احمد خان خود فرماتے ہیں کہ میرے کلام کی سب سے زیادہ تشہیر شوکت نے کی ہے۔ میں نے ان سے بارہا کہا ہے کہ تم آخر سنجیدگی کے ساتھ شاعری کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے۔ جواب ہمیشہ یہی ملتا ہے کہ جس کو تم سب غیر سنجیدگی کہہ رہے ہو۔ میرے نزدیک وہی سنجیدگی ہے۔ میں شعر میں دل اور جگر کہہ کر جھوٹ بولنا نہیں چاہتا۔ ان پردوں کی میری رائے میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بات کھری کیوں نہ کہی جائے۔ ان کو امید ہے کہ وہ دن قریب ہے۔ جب ان کا کلام کورس کی کتابوں میں شامل ہو کر داخل نصاب ہو جائے گا۔

بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں ان کو مات کھاتے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ نہایت متین چہرہ بنا کر ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ دھوئے دھوئے نہ چھوٹے۔ کیسی ہی تکلیف ہو' دل پر جو عالم بھی گزر رہا ہو مگر رفیع احمد خان کی زندگی پر مردنی کبھی نہیں چھا سکتی۔ حال ہی میں آپ کی خالہ صاحبہ محترمہ کا انتقال ہوا۔ جنہوں نے اولاد کی طرح آپ کو پالا تھا۔ مجھے اطلاع ہوئی' میں جنازہ میں شرکت کے لیے فوراً پہنچا۔ رفیع احمد خان خلاف معمول چہرہ لٹکائے نظر آئے مگر مجھے دیکھتے ہی علیحدہ لے گئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''بھائی اس مصیبت کے وقت ایک احسان مجھ پر یہ کرو کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔'' میں حیران تھا کہ کیا ماجرا ہے۔ کہنے لگے۔ ''خدا کی قسم' ہنسی آ جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ دیکھو اس درندے کو کہ موت پر ہنس رہا ہے۔'' پھر میں نے لاکھ لاکھ نہ ہنسنے کا وعدہ کیا۔ مگر توبہ کیجئے۔ جب تک مجھ کو وہاں سے واپس نہیں کیا' برابر میرے سر رہے کہ خدا کے لیے چلے جاؤ' یا میں خود کہیں چلا جاتا ہوں۔

کافی عمر آ چکی ہے۔ بظاہر صاحب اولاد نہیں ہیں لیکن اس کا بھی غم نہیں۔ کہتے ہیں کہ خدا ایک در بند کرتا ہے تو ہزار در کھول دیتا ہے۔ بیماریوں نے قبل از وقت بوڑھا ضرور کر دیا ہے مگر پوپلے منہ میں قہقہوں اور تبسموں کی آج بھی کوئی کمی نہیں۔ کیا کوئی نوجوان اس قدر زندہ ہو گا جس قدر یہ جوانی کی حدوں سے گزرا ہوا انسان زندہ اور شگفتہ ہے۔

واقع ہوئے ہیں آپ پٹھان اور طبیعت پائی ہے لطافت پسند۔ نٹھوری کا یہ عالم ہے کہ چاقو سے لے کر بندوق تک سب ہی کچھ رکھتے ہیں اور لطافت پسندی کی انتہا یہ کہ پٹھان ہوتے ہوئے بھی بغیر حلال کئے گوشت نہیں کھا سکتے۔ دسترخوان پر خلالوں کا ڈبہ ہونا ضروری ہے۔ شکار سے بھی شوق ہے اور شاعری سے بھی' پھر بھی بیکار آدمیوں میں نہیں ہیں بلکہ ذمہ داریاں تو اتنی اوڑھ رکھی ہیں کہ ایمانداری کے ساتھ کوئی وعدہ کرنے کے باوجود اپنے فرائض کی کثرت میں گم ہو کر ایفا کو بھول جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً وعدہ ہے کہ شام کے پانچ بجے کسی پارٹی میں ساتھ ہی چلیں گے۔ تیسرے دن پتہ یہ چلے گا کہ خلق اللہ کو فائدہ پہنچانے کے لیے آپ شکار پر چلے گئے تھے۔ اور وہاں چونکہ شکار نہیں ملا لہٰذا تاش کا کوئی ایسا کھیل شروع ہو گیا جو آج تیسرے دن ختم ہوا۔ اب بتائیے کہ ان کے فرائض کا کیا علاج ہے اور وعدہ خلافی

میں خان صاحب کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔

جو دوست ہیں وہ اس جادوگر سے لڑ نہیں سکتے۔ روٹھ نہیں سکتے۔ بائیکاٹ نہیں کر سکتے۔ پکا ارادہ کر لیا ہے کہ اب خان صاحب کی ناز برداری ختم۔ وہ ہماری پرواہ نہیں کرتے تو ہم ان کی کیوں پروا کریں۔ ان کی طرف جائیں گے تو بھی ان کے گھر کا رخ نہیں کریں گے۔ ان کے سلام کا جواب تک نہ دیں گے۔ ارادہ کر ہی رہے تھے کہ دیکھتے کیا ہیں کہ سامنے سے خان صاحب چلے آ رہے ہیں۔ اڑا اڑا دھم۔ سارا قلعہ مسمار ہو گیا۔ دوڑ کر لپٹ گئے۔ پھر وہی ہاہا ہوہو۔ قہقہے لگ رہے ہیں۔ قوالیاں ہو رہی ہیں۔ پکے گانے گائے جا رہے ہیں۔ کچے شعر پڑھے جا رہے ہیں۔ نقلیں ہو رہی ہیں کہ یکایک کوئے صاحب تشریف لائے۔ خان صاحب سے کسی علمی مسئلہ پر تبادلہ خیال کرتے۔ خان صاحب ایک دم ٹھوس علمی آدمی بن گئے۔ ان کے جاتے ہی پھر منہ سے پھول اور چہرہ سے ٹھیکرے برسنے لگے۔ ایک مستقل انجمن۔ ایک سراپا مسرت۔ ایک مجسم زندگی، ایک مسلسل ہنگامہ۔ کاش ایسے لوگ دنیا میں چند اور بھی ہوتے۔

◆ ◆ ◆

روش صدیقی

کلام سن کر عظمت کو اور صورت کو دیکھ کر شفقت کو دل چاہتا ہے۔ کلام نہایت وزنی اور خود نہایت ہلکے پھلکے۔ سناتے اس طرح ہیں گویا بھڑک رہے ہیں۔ کلام کے زور میں اکثر خود اڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آواز اچھی ہے اور گلے میں سر بھی ہے مگر جوش میں آ کر جب بے سرے ہوتے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ خلافت فنڈ کے لیے اپیل کرتے کرتے بالشتیوں کے مولانا شوکت علی کو غصہ آ گیا ہے۔ نتھنے پھول جاتے ہیں۔ گھونسا تان لیتے ہیں اور پھر اسی گھونسے سے تعریف کرنے والوں کو سلام بھی کر لیتے ہیں۔ مشاعروں کی شرکت عبادت کی طرح پابندی سے کرتے ہیں۔ آج آگرہ میں ہیں تو کل گوپامئو میں کبھی بنارس میں ہیں تو کبھی کسی غیر معروف مقام پر مشاعرے میں نظر آ رہے ہیں۔ نیشنلسٹ شاعر ہونے کا دعویٰ ہے۔ وردی کے طور پر کبھی کبھی کھدر بھی پہن لیتے ہیں۔ ورنہ دراصل آپ کو سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ نظم کے علمبرداروں میں اس طرح شامل ہیں جس طرح راجہ پورس کی فوج میں ہاتھی شامل تھے۔ یعنی بوقت ضرورت غزل بھی اس طرح پڑھ دیتے ہیں کہ نظم کی تمام علمبرداری سرنگوں ہو کر رہ جاتی ہے۔

فطرتاً بہت معصوم صورتاً نہایت خام مگر اقتصادی معاملات میں نہ معصوم نہ خام بلکہ نہایت پکے بزنس مین ”یک سخن“ کی قسم کے ضدی بھی اور ”نو نقد نہ تیرہ ادھار“ کی قسم کے منہ پھٹ بھی۔

◆ ◆ ◆

ریاض خیرآبادی

سنا ہے کہ ریاض مرحوم کبھی بڑے بانکے چھبیلے رسیلے بھی تھے مگر میں نے اس وقت آپ کو دیکھا جب داڑھی اور سر کے بالوں کے علاوہ ابرو تک سفید ہو چلے تھے۔ والد صاحب مرحوم کے خاص احباب میں سے تھے لہٰذا زیادہ حدآداب۔

ریاض صاحب ضعیفی میں بھی کبھی کبھی جوان ہو جایا کرتے تھے۔ وصل صاحب بلگرامی کے یہاں قیام ہے۔ صفدر مرزاپوری مرحوم کے لوگ چھیڑ رہے ہیں۔ آپ نہایت متانت سے لیے دیئے بیٹھے ہیں۔ چپکے سے مجھے بلایا۔ کان میں فرمایا 'صفدر سے کہو کہ اپنے ذاتی شعر کہا کریں اور سمجھا بجھا تو اردو چھوڑ دیں۔ میں نے صفدر صاحب سے یہی بات کہہ دی۔ بس پھر کیا تھا۔ صفدر صاحب میری جان کو آ گئے اور ریاض صاحب رضائی میں منہ چھپا کر پہلے ہنستے رہے پھر سو گئے۔

ایک دن اپنے کسی مرضی کے علاج کے لیے لکھنو کے ایک ٹھاکر صاحب کے پاس تشریف لے گئے جو مسمریزم سے ہر مرض کا علاج کرتے تھے۔ وہاں سے واپس آ کر کہنے لگے کہ صاحب عجیب طریقہ ہے۔ مریض کے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور مریض بیہوش ہو جاتا ہے۔ بس یوں ہاتھ پھیرتے ہیں۔ یہ کہہ کر وصل بلگرامی صاحب کے گلے پر ہاتھ پھیرا ہی تھا کہ وصل صاحب بیہوش ہو گئے۔ پہلے ہم لوگ سمجھے کہ وصل صاحب نے تمثیل کی تکمیل کی ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ واقعی بے ہوش ہیں۔ دس منٹ' پندرہ منٹ' آدھ گھنٹہ یہاں تک کہ ایک گھنٹہ اسی عالم میں گزر گیا۔ ریاض صاحب کی پریشانی کچھ نہ پوچھئے کبھی دوا کرتے تھے کبھی دعا کبھی گھبرا کر دونوں کو بھول جاتے تھے۔ وصل صاحب کے انتقال سے زیادہ اپنے خونی ہونے کی فکر تھی۔ خدا خدا کر کے وصل صاحب کو ہوش آیا اور ریاض صاحب کی جان میں جان آئی۔

ریاض صاحب سے جب ملاقات ہوئی ہے وہ مشاعروں کی شرکت اور شعر خوانی ترک کر چکے تھے مگر کبھی کبھی جب کوئی خودکشی کی دھمکی دے دیتا تھا۔ شعر سنا دیتے تھے۔ مگر اس طرح گویا ایک ناگوار فرض ادا کر رہے ہیں۔ یا کوئی بیگار بھگت رہے ہیں۔ افلاس اور تنگدستی کے باوجود بڑی آن بان کے آدمی تھے۔ رسی جل گئی تھی مگر بل باقی تھے۔ آخر اسی آن بان کے ساتھ اٹھ گئے اور دیوان تک مرنے کے بعد شائع ہوا۔

◆◆◆

زاہدہ خلیق الزماں

حاجی محمد اصطفیٰ خان صاحب اصطفا' مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کے یہاں ایک مشاعرہ تھا۔ غالب کی طرح تھی۔

''جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا''

میری غزل میں ایک شعر تھا۔

موت برحق تھی مگر کاش نہ آتی شب غم
یہ تو کہنے کو نہ ہوتا کوئی ارماں نکلا

مشاعرہ کے کچھ دنوں کے بعد اصطفا خان صاحب نے فرمایا کہ بھئی تمہارا یہ شعر پڑھ پڑھ کر سناتی رہتی ہے۔

کچھ دنوں کے بعد مس زاہدہ ارتضیٰ خان کی حیثیت سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ خود بھی شعر کہتی ہیں۔ کلام سنا تو حیرت ہوگئی کہ اس قدر پختگی اور پردہ ہی پردہ میں پھر تو برابر سننے سنانے کا مشغلہ ہوتا رہا۔ ہم ان کے شوکت بھائی اور وہ نہایت بے تکلفی کے ساتھ عزیزہ زاہدہ بن گئیں۔ یہاں تک کہ چودھری خلیق الزماں صاحب ایم ایل اے کے ساتھ جب ان کا عقد ہوا تو شوکت بھائی ان گواہوں میں تھے جو دلہن سے ''ہونہہ'' کہلوانے حجلہ عروسی تک جاتے ہیں۔ اب وہ عرصہ سے محض زاہدہ نہیں بلکہ بیگم زاہدہ خلیق الزماں ہیں۔ متعدد بچوں کی ماں اور اتنے بڑے شوہر کی بیوی ہیں مگر اب تک شوکت بھائی اس انداز سے کہتی ہیں کہ وہی جھبری جھبری زاہدہ آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ مسلم لیگ کے ایک عظیم الشان مشاعرے کی صدارت فرما رہی تھی۔ خطبہ صدارت ارشاد فرمانے کے لیے جس وقت کھڑی ہوئی ہیں تو وہ اپنے کو صدر منتخب سمجھ رہی ہوں گی اور میری نگاہوں میں ان کی وہ تصویر پھر رہی تھی۔ جب وہ شوکت بھائی کو اپنی پہلی غزل سنانے کے وقت اس طرح ہمت پیدا کر رہی تھیں جس طرح شوکت بھائی اس وقت ان کا تذکرہ لکھنے کے لیے ہمت پیدا کر رہے ہیں مگر ناکام ہیں۔

◆◆◆

ساغر نظامی

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

۱۹۲۴ء کو ایک عمر ہوئی' گویا انیس سال کے بالغ تعلقات ہیں۔ ساغر صاحب پاکٹ سائز کے رسالہ پیمانہ کے ایڈیٹر تھے اور یہ خاکسار حسن ادب نامی ایک نہایت تھرڈ کلاس رسالہ کا ایسا ایڈیٹر تھا کہ سرورق پر اپنے کو خود ''ملک التحریر'' لکھ لکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ نہ املا درست تھا نہ انشا مگر تھے ایڈیٹر بھی' شاعر بھی اور مضمون نگار بھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر بے حد قابل تھے۔ خیر ساغر صاحب کی نکیل تو مولانا سیماب کے ہاتھ میں تھی۔ مگر یہاں شتر بے مہار کا عالم تھا۔ نہ جانے کیا کیا خرافات فرمایا کرتے تھے۔ خیر ہمارا تو پوچھنا ہی کیا مگر ان ''خیام العصر خالق جذبات'' صاحب کا بھی یہ عالم تھا کہ ہمارے ایک نہایت پر تکلف لفافے سے متاثر ہو گئے۔ لفافہ سرخ رنگ کا تھا اور اس میں اودا استر تھا۔ ساغر صاحب نے اس لفافے کے متعلق لٹریچر میں اس طرح اضافہ فرمایا تھا۔ ارغوانی شراب اور اودی گھٹاؤں کے ساتھ الپناہ! اس ''الپناہ'' والی عربی میں جو ''پ'' ہے وہ اضافہ نہیں تو اور کیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم لوگوں کی خط و کتابت عام طور پر لٹریری ہوا کرتی تھی' اور کیوں نہ ہوتی۔ ادیب جو ٹھہرے' ایڈیٹر جو ہوئے۔

ساغر صاحب سے جب تک ملاقات نہیں ہوئی وہ سمجھتے تھے کہ یہ شوکت نہایت ''الپناہ'' ہوگا۔ اور شوکت سمجھتے تھے کہ یہ ساغر یقیناً ''اشد من الموت'' ہوگا۔ مگر جب ملاقات ہوئی تو اس خاکسار نے ترک موالات کے بہانے تعلیم چھوڑ کر داڑھی رکھ لی تھی۔ اس سے دو فائدے پہنچ رہے تھے ایک تو یہ کہ تعلیم چھوڑنے پر کسی کو اعتراض کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ دوسرے وہ شادی جو فیل ہونے کی وجہ سے گڑبڑ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس داڑھی کے بدولت پختہ ہو رہی تھی۔ بہر حال ساغر صاحب شوکت کی داڑھی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ البتہ شوکت نے ان کو وہی پایا۔ جس کا اندیشہ تھا یعنی تقریباً شاہزادہ گلفام' ساغر صاحب ٹھہرے ''الپناہ'' اور ہم بھی جناب کچھ کم تو تھے نہیں ''ملک التحریر'' تھے۔ مذاق نہ باشد۔ چنانچہ گفتگو کچھ اس طرح شروع ہوئی۔

''شوکت صاحب یہ نظریہ بھی ایک کلیہ ہے کہ سفر کی خرافاتیت شاعر کی لطافت زائیوں کے صعوبات کا ایک عظیم انبار ہوتی ہے۔''

''مگر ساغر صاحب میرے لیے تو یہ عید نظارہ ہے کہ آپ شمشیر سخن بن کر عریاں ہوتے ہیں اور میرے جذبات فقدان اظہار کے باوجود بیانگ دہل یہی کہہ رہے ہیں۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

”یہ دراصل آپ کی مقناطیسیت تھی کہ میں گنبد تاج کے مرمریں سایہ کو چھوڑ کر عروس البلاد کے حجلۂ شعر آگیں میں نظر آرہا ہوں۔“

داڑھی پر ہاتھ پھیر کر عرض کیا۔ ”ایمان کفر کا میزبان ہے۔“

چوڑی دار پاجامے کی چوڑیاں مرتب کرتے ہوئے فرمایا۔ کس قدر شعر بدوش بات کہی ہے آپ نے ایک میکدۂ رقصاں و لرزاں کا کیف‘ اس ایک جملہ میں محبوس ہے۔

مختصر یہ کہ دو قاموسی پاگل ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ ایک آدھ ملاقات تو اسی طرح ہوئی کہ دونوں اپنی اپنی کہتے تھے اور سمجھنے کا دونوں طرف ذکر نہ تھا۔ پھر ذرا بے تکلف ہوئے مادری زبان بولنے کی کوشش کی۔ مگر ہر ملاقات میں ساغر صاحب کوئی نہ کوئی پہاڑ ہمارے لیے ضرور لاتے رہے کبھی ”ردعمل“ کبھی ”نئے تقاضے“ کبھی کچھ نہیں تو بات بات پر ”سماج کے بندھن“ کی رٹ۔ مختصر یہ کہ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسی کی گھٹی میں لغات پڑ جائے۔

ساغر حسین ہیں‘ ذہین ہیں‘ آرٹسٹ ہیں‘ آرٹ ہیں‘ خوش لباس ہیں‘ خوش خوراک‘ خوش وضع‘ خوش اخلاق‘ یہاں تک کہ ”خوش آمدید“ تک ہیں مگر خوش قسمت نہیں ہیں۔ یہ صرف مجھے معلوم ہے کہ میرا ساغر کس قدر بد قسمت ہیں۔ ساغر کو فکر معاش سے آزاد ہونا چاہیے تھا۔ ساغر کو شعروادب کا پیشہ اختیار کرنا نہ پڑتا۔ یہ محض شوق ہوتا سار کے لیے ایک تاج محل کی قسم کا محل ہوتا جس کے آئینہ خانہ میں ساغر ہر وقت بنتے سنورتے رہتے کچھ حسین مصاحب ہوتے جو ان آرائشوں کی داد دیتے۔ کوئی گلاب پاشی کرتا اور کوئی عطر بیزی‘ پھر اگر ساغر جھوم جھوم کر پڑھتے ”پٹ مندر کے کھول پجاری پٹ مندر کے کھول“ تو اس کا کیف ہی کچھ اور ہوتا۔ مگر یہ شاعر مزدور بن کر رہ گیا ہے۔ ادب کا مزدور ہے۔ بقول جوش کے یہ کم بخت جنس ہنر بیچتا ہے۔ اور جی بھر کے اپنے کو حسین سمجھنے‘ جامہ زیب دیکھنے‘ جاذب نظر تسلیم کرنے کا موقعہ بھی تو نہیں ملتا۔

فطرتاً آزاد ہیں۔ ایسے آزاد کہ نکاح کی قیمت پر بھی آزادی کو فروخت کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ شاید یہ سودا ابھی کبھی ہو جائے۔ تادم تحریر تو آپ نے اعتراف شکست کیا نہیں ہے اور اچھا ہی ہے اس لیے کہ پندار حسن اور شادی میں نہایت خطرناک تضاد ہے۔ اس تضاد کا نتیجہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ دونوں کے رخ روشن کے سامنے شمع ہے اور دونوں بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ ”ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے“

ساغر صاحب کو رہنمائی کا بڑا شوق ہے۔ حالانکہ واقع ہوئے ہیں۔ نہایت سخت رہزن‘ رہزن تمکین و ہوش‘ رہزن عقل و خرد وغیرہ۔ اصولاً اس قسم کے رہزنوں کو رہنما ہونا تو نہ چاہیے۔ ویسے مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔

طبعاً نیشنلسٹ اور وضع قطع میں پیرس کا دھلا ہوا کھدر واقع ہوئے ہیں۔ بوقت ضرورت سوٹ بھی پہن لیتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر

شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں نظر آتے ہیں۔ اور سوچ پوچھئے تو ان کی رعنائیاں اسی لباس میں شباب پر آتی ہیں۔ پہلے بال بہت خوبصورت تھے۔ اب بالدار ٹوپی میں خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔

ساغر کی خلوتوں کے بہت سے دلچسپ لطیفے اسوقت دماغ میں تو ناچ رہے ہیں مگر قلم سے اس لیے نہیں نکلتے کہ اپنا پول بھی کھلے گا اور ممکن ہے کہ جیل کا دروازہ بھی کھل جائے۔ لہٰذا زیادہ حدادب...... ''اسٹاپ پریس''

تازہ ترین اطلاع مظہر ہے کہ ساغر صاحب کی شادی ہوگئی۔ خدا کرے یہ خبر سچی ہو۔ حالانکہ ساغر صاحب کے متعلق اس قسم کی خبر کا معلوم نہیں کیوں دل کو اعتبار نہیں آتا۔ بہر حال تفصیلات کا انتظار ہے۔

◆◆◆

سالک

مولانا عبدالمجید سالک ایڈیٹر ”انقلاب“ لاہور

سالک صاحب سے ایک طرفہ ملاقات تو اس وقت کی ہے جب آپ روزنامہ ”زمیندار“ کے افکار و حوادث میں اپنی قیامت خیز ظرافت کے کمالات دکھاتے تھے اور یہ خاکسار اپنے میدان میں بالکل مبتدی تھا یعنی روزنامہ ہمدم کا مزاحیہ کالم ”دو دو باتیں“ لکھنا گویا بالکل شروع ہی کیا تھا۔ مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ میں اس وقت کے تمام اخبارات کے مزاحیہ کالم بلا ناغہ پڑھا کرتا تھا اور سوائے افکار و حوادث کے کسی مزاحیہ کالم سے کبھی مرعوب نہ ہوتا تھا۔

پہلی مرتبہ لاہور آیا تو شالامار اور جہانگیر کے مقبرے کے علاوہ قابل دید چیزوں میں سالک صاحب کو بھی اپنے پروگرام میں رکھا تھا۔ دفتر ”انقلاب“ میں ملاقات ہوئی۔ مل کر بے حد خوش ہوا اور سالک صاحب کو حسب توقع زندہ پایا۔ حالانکہ روزانہ اخبار کے دفتروں میں جو لوگ زندہ ہوتے ہیں، وہ بھی زندہ درگور نظر آتے ہیں مگر سالک صاحب کے اردگرد کہیں گور کا پتہ نہ تھا۔ زندگی ہی زندگی تھی۔

میرے آخری اخبار روزنامہ ”طوفان“ کے تبادلہ میں ”انقلاب“ برابر آتا رہا۔ جب طوفان بند کیا تو تمام اخبارات کو جو تبادلے میں آتے تھے اطلاع دے دی کہ بھائی مراسم ختم کرو مگر ”انقلاب“ کو دانستہ اطلاع نہ دی اور اس بے ایمانی کے طفیل طوفان بند ہونے کے تین مہینے بعد تک افکار و حوادث پڑھتے رہے۔ آخر انقلاب والوں نے شاید خود پتہ لگا لیا ہوگا کہ یہ پرچہ ضائع ہو رہا ہے۔

سالک صاحب کو میں بہت بڑا مزاح نگار مانتا ہوں۔ اگر وہ افکار و حوادث سے آزاد ہوتے تو پطرس کے پایہ کے مزاح نگار تسلیم کیے جاتے۔ اب بھی سیاسی ظرافت میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ البتہ ان کے مزاح میں فرقہ وارانہ جھلک ضرور ہے اور یہ قصور ان کا نہیں۔ دراصل اخبار نویسی کی خطا ہے۔

مسکراتا ہوا چہرہ، ہنستی ہوئی آنکھیں۔ اردو بولیں تو قطعاً پنجابی نہیں معلوم ہوتے اور پنجابی بولتے ہیں تو یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ یہ شخص اردو جانتا بھی ہوگا۔

شعر خوب کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ آواز ترنم کی حد تک نہیں بلکہ غنا کی حد تک اچھی ہے۔

سالک صاحب کو دور سے قابل قدر سمجھ کر دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر قابل قدر سمجھے تھے مگر قریب سے تو وہ کچھ اور ہی ہیں۔ سوسائٹی کے لیے ایک چلتی پھرتی رحمت۔ خود زندہ اور دوسروں کے لیے زندگی۔ مصیبت تو یہ ہے کہ وہ جس حد تک دلچسپ ہیں اس حد تک ہم بیان بھی تو نہیں کر

سکتے۔ ہم چونکہ ادیب ہیں۔ تہذیب کے علمبردار ہیں۔ لہٰذا جہاں سچ بولنے کو جی چاہتا ہے۔ وہاں اعتبارات کی دفعہ ۱۴۴ نافذ ہو جاتی ہے اور ہم زیادہ حد ادب کہہ کر رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ سالک جس قدر دلچسپ نظر آتے ہیں' وہ دراصل ان کی دلچسپ شخصیت کی محض ایک جھلک ہے ورنہ وہ تو قیامت ہیں۔

دم بخود ہیں حضرت زاہد یہیں تک دیکھ کر
ہوش اڑ جاتے اگر شیشے کے باہر دیکھتے

◆ ◆ ◆

سائل دہلوی

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی۔

داغ کے داماد بھی مگر ہمارے تو بزرگ ہی ہیں۔ مشاعروں کے طفیل میں ہمیشہ نیاز حاصل ہوا ہے۔ کبھی لکھنو میں کبھی دہلی میں۔ مرعوب ہونے کے مواقع بھی پیش آئے ہیں لیکن شاعری کے سلسلے میں نہیں بلکہ شخصیت کے سلسلہ میں۔

آخری ملاقات دہلی کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی جہاں آپ بمشکل تمام ایک کرسی پر بیٹھ کر آئے تھے۔ عجیب عبرت انگیز منظر تھا اور دل بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ شوکت صاحب مشاعروں کی شرکت چھوڑیئے۔ ورنہ بعد میں مشاعرے نہ چھوڑیں گے آپ کو یہ بزرگ تو محض کرسی پر تشریف لائے ہیں لیکن زمانہ برابر ترقی کر رہا ہے۔ آپ کو اپنی قبر میں بیٹھ کر مشاعرے میں آنا پڑے گا۔

سائل صاحب نہایت شفیق بزرگ۔ نہایت کہنہ مشق شاعر۔ نہایت خوش آواز پڑھنے والے اور نہایت باوضع اگلے وقتوں کے لوگ ہیں۔ داغ کی جانشینی کے دعوے دار تو خیر بہت سے ہیں مگر سائل صاحب داماد بھی ہیں۔ لہٰذا حق سچ پوچھے تو آپ ہی کو پہنچتا ہے۔

◆◆◆

سبط حسن

سید سبط حسن ایڈیٹر ماہنامہ ''نیا ادب'' لکھنو (فی الحال بمبئی)

سبط حسن سے واقفیت بہت پرانی اور دوستی بالکل نئی ہے۔ دو دیر آشناؤں میں دوستی عرصہ تک معلق رہی۔ آخر دونوں آگے بڑھے اور گلے مل گئے۔

سبط حسن لکھنو کی ککڑیوں کی طرح نازک۔ کوکا بیلی کے باسی پھول کی طرح حسین اور تکلیفیں اٹھانے میں آہنی قسم کے مضبوط انسان ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں میں نہایت وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ البتہ یہ فیصلہ ابھی نہیں ہوا ہے کہ وہ ترقی پسند زیادہ ہیں یا ادیب زیادہ اور سچ پوچھئے تو یہ فیصلہ بہت سے ترقی پسند ادیبوں کے متعلق ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ بہر حال سید سبط حسن ان ترقی پسند ادیبوں میں سے یقینا نہیں ہیں جن کے متعلق یہ طے ہو چکا ہے کہ ترقی کم۔ پسند زیادہ اور ادیب بالکل نہیں۔

سبط حسن یوں تو جونپور کے رہنے والے ہیں۔ لیکن اپنا وطن اسٹالن گراڈ کو ظاہر کرتے ہیں اور میکسم گورکی کا ذکر اس پیار سے کرتے ہیں کہ کیا کوئی اپنے کسی عزیز کا ذکر کرے گا۔ جب یہ نحیف و نزار سوشلسٹ اپنے منہ میں چرچل والا سگار دبا کر کامریڈ اسٹالن کی باتیں کرتا ہے تو میں یہ سوچا کرتا ہوں کہ اس قدر کے انسان کو کس قدر کا سگار پینا چاہیے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں ان کی سیاسی قابلیت میں محو ہو کر رہ گیا ہوں۔ حالانکہ میں ان کی صحت کے متعلق غور کیا کرتا ہوں کہ مجنوں اگر گریجویٹ ہو کر سوشلسٹ ہو جاتا تو یقینا ایسا ہی ہوتا یا سبط حسن اگر گریجویٹ اور سوشلسٹ ہونے کے بجائے نجد میں چھوڑ دیئے جاتے تو خود لیلیٰ کو ان میں اور مجنوں میں امتیاز دشوار ہو جاتا اور بیچاری یقینا دھوکہ کھا جاتی۔

◆ ◆ ◆

سپرو

رائٹ آنریبل سرتیج بہادر سپرو۔

سرتیج بہادر سپرو سے ملاقات ہونے کی دو ہی چار صورتیں ممکن ہیں مثلاً یا تو آدمی وائسرائے ہو یا مہاتما گاندھی یا شاعر یا کم سے کم جرائم پیشہ، خیر وائسرائے یا مہاتما گاندھی تو ہر ایک ہو نہیں سکتا۔ البتہ اگر شاعر ہے تو مشاعروں میں ادب اردو کے اس شیدائی کو کبھی نہ کبھی دیکھ لے گا اور جرائم پیشہ ہے تو اپنے کو بری کرانے کی آخری صورت اس کی سمجھ میں یہی آئے گی کہ سر سپرو سے اپنے مقدمہ کی پیروی کرائے۔ بہر حال یہ آخری سعادت تو ہم کو حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ مشاعروں اور ادبی اجتماعوں میں ادب اردو کے اس محسن اعظم کی قربت کے مواقع اکثر و بیشتر حاصل ہوئے۔

سر سپرو کو اردو شاعری سے عشق کی حد تک دلچسپی ہے۔ کہہ کر مشاعرے منعقد کراتے اور رات رات بھر ایک ہی پہلو سے بیٹھ کر کلام سنتے ہیں۔ ان کا ایسا مصروف اور کبھی مہلت نہ پانے والا انسان اگر وقت نکلتا ہے تو صرف شعر و سخن کی محفلوں کے لیے ہندوستانی اکیڈمی کا ایک جلسہ لکھنو کی بڑی نمائش ۱۹۳۷ء کے موقع پر لکھنو میں ہوا۔ میں نے بھی ایک مزاحیہ لکھنو اور لکھنویت کے موضوع پر پڑھا تھا۔ سر سپرو نے اس مقالہ کو مکمل سنا اس ادا کے ساتھ کہ میں اپنے مضمون کی داد وصول کرنا بھول کر ان کے سننے کی داد دینے کے لیے بے چین ہو گیا۔ تمام مضمون کے ان مقامات پر سر سپرو کی آنکھوں میں خاص چمک نمایاں دیکھی جن مقالات پر میں نے اپنے نزدیک اپنا آرٹ صرف کیا تھا۔

لکھنو کی انجمن بہار ادب کے ایک سالانہ مناثرہ میں مجھ کو پھر مقالہ پڑھنے کا اتفاق ہوا اور اتفاق سے سر سپرو ہی صدر نشین تھے۔ یہاں بھی ان کے حسن سماعت کا قایل ہونا پڑا۔ آخر اپنے مجموعہ مضامین میں طوفان تبسم ہی کو سر سپرو کے نام معنون کر دیا کہ کہاں تک میں ایک ایک مقالہ سناتا رہوں گا۔

سر سپرو ادب اردو کے ان محسنوں میں سے ہیں کہ آپ نے اردو کی حمایت میں کبھی اپنی گھریلو مخالفت کی بھی پروانہ کی اور بہانگ دہل یہی کہا کہ میں اردو کو ایک ایسی زبان تسلیم کرتا ہوں جو ہندو مسلم اتحاد کی جیتی جاگتی منہ بولتی سر کھیلتی یادگار ہے۔ ایک اجتماع میں سر سپرو نے "ہندوستانی" کے متعلق بھی بہت خوب کہا کہ میں اردو کا قال ہوں میں ہندی کا قائل ہوں مگر یہ ہندوستانی کیا بلا ہے، اس سے بالکل واقف نہیں ہوں۔

خواجہ حسن نظامی صاحب بعض اوقات بڑی دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ سرتیج بہادر سپرو کے متعلق الہ آباد کے ایک اجتماع میں آپ نے

فرمایا کہ آپ یوں تو سر تیج ہیں مگر اردو کے سرتاج ہیں اور اردو آپ کو سپرو نہیں اپنا سپر سمجھتی ہے۔ خواجہ صاحب کی یہ تشریح صرف صنائی نہیں واقعہ بھی ہے۔

◆◆◆

سجاد حیدر یلدرم

سید سجاد یلدرم!

بچپن سے سید سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد حیدر صاحبہ کے نام سنتے چلے آئے تھے۔ مضامین اور افسانے برابر پڑھے تھے مگر ملاقات ہوئی لکھنو ریڈیو اسٹیشن پر یوں دیکھ چکے تھے علی گڑھ میں بھی۔

دبلے پتلے، دھان پان، ترکی ٹوپی پہنے ہوئے گویا مہاتما گاندھی بوڑھے ہو چکے ہیں مگر اب تک شرمیلی طبیعت ہے۔ اپنی ادبی خدمات کا شاید احساس ہی نہیں غرور تو دوسری چیز ہے اپنے سامنے کے ادبی بچوں کا بھی اس انداز سے احترام کرتے ہیں۔ گویا آپ خود تو کچھ ہیں ہی نہیں جو کچھ ہیں یہ نئی پود کے برخورداران ادب ہیں۔

مختصر افسانہ نگاری کے باوا آدموں میں سے سجاد حیدر بھی ایک ہیں۔ ایک زمانہ میں آپ کی نظمیں بھی پڑھی تھیں۔ مزاحیہ بھی اور سنجیدہ بھی، مگر اب عرصہ سے کچھ نہیں کہتے۔ افسانے لکھنا بھی بہت ہی کم کر دیئے ہیں گویا ادب کے بھی پنشنر ہو کر بیٹھ رہے ہیں۔

میں یہ سطریں لکھ ہی چکا تھا کہ سجاد حیدر یلدرم کے سفر آخرت کی خبر بھی سن لی۔ افسانہ نگار خود افسانہ بن کر رہ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

◆◆◆

سہا مجددی

ہندوستان کے جتنے بڑے اتنے ہی چھوٹے شاعر

بچپن سے نام سنتے چلے آئے تھے۔ کلام پڑھ کر جھومتے تھے اور ملنے کو دل چاہتا تھا۔ آخر عجیب وغریب طریقہ پر ملاقات ہوگئی۔ نام بتانے کی ضرورت نہیں، بہرحال ایک جگہ ہم اس لیے بلائے گئے تھے کہ ہماری غزلوں کے دو ریکارڈ بھر کر ان کی پروف کاپی آئی ہوئی تھی اور مقصد یہ تھا کہ ہم بھی سن لیں۔ چنانچہ وہ ریکارڈ سنتے رہے، ریکارڈ سننے کے بعد گراموفون بند جو کیا گیا تو ڈھکنے کے بند ہونے کے بعد پتہ چلا کہ اس طرف ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے جو اس قدر مختصر تھے کہ گراموفون کے ڈھکنے کی وجہ سے نظر نہ آسکے۔ تعارف کرایا گیا کہ آپ ہی مولانا سہا ہیں۔ مدت کی آرزو اس لطیفہ کے ساتھ بر آئی۔ پھر تو مولانا سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

قدرت نے اتنے سے جسم میں سب ہی کچھ مہیا کر دیا ہے۔ مگر دماغ جسم کے تناسب سے بہت بڑا عطا کیا ہے۔ ادب اردو میں مولانا کو بہت بڑا درجہ حاصل ہے صرف شاعری کی حیثیت سے نہیں بلکہ نقاد کی حیثیت سے بھی۔ غالب کے آپ خاص اسکالر ہیں اور دیوان غالب کے شارحین کی فوج کی صف اول میں نظر آتے ہیں۔ مولانا کے سامنے کوئی ادبی گتھی لے کر جائیے۔ اس خوبصورتی سے سلجھائیں گے کہ نہ صرف دل کو اطمینان ہو جائے گا بلکہ دماغ اس غلط فہمی میں بھی مبتلا ہو جائے گا کہ خواہ مخواہ اس معمولی سی بات کو اتنی اہمیت دی تھی۔ حالانکہ یہ دراصل مولانا کا کمال ہوتا ہے کہ پتھر کو پانی بنا کر بہا دیتے ہیں۔

مولانا کی ادائیں بعض اوقات اتنی دلکش ہوتی ہیں کہ ان سے کھلونے کی طرح کھیلنے کو جی چاہتا ہے اور کبھی کبھی مولانا ایسے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو کیونکر سنبھالا جائے مگر بحیثیت مجموعی مولانا سہا قابل قدر شخصیت ہیں اور صحیح معنوں میں ناز برداری کے مستحق۔

◆◆◆

سیدہ سردار اختر

آپ کا نام پہلے لیڈر۔ پھر خطیبہ اور آخر میں شاعرہ کی حیثیت سے سنا۔ رسالوں میں اکثر نظموں اور غزلیں بھی نظر سے گزریں اور پھر آپ خود بھی ایک دن لکھنو ریڈیو اسٹیشن پر نظر آ گئیں۔ آپ کا کلام آپ کی زبان سے سنا۔ اپنا کلام اپنی زبان سے سنایا۔ حالانکہ کلام سناتے ہوئے معلوم نہیں کیوں مرعوب تھے جس کا اندازہ خود اپنی آواز کی تھرتھراہٹ سے ہو رہا تھا۔

محترمہ سیدہ سردار اختر صنف نازک کے لفظ "نازک" کی طرفدار نہیں معلوم ہوتیں۔ قومی جوش میں بھی کسی مرد خادم قوم سے آپ پیچھے نہیں ہیں۔ شعر بھی بہت سے شاعروں سے اچھے کہتی ہیں اور پڑھتی بھی خوب ہیں۔ پڑھنے کے طریقے میں اور شعر کی بندشوں میں حضرت جگر مرادآبادی سے متاثر نظر آتی ہیں۔

◆◆◆

سیماب اکبرآبادی

مولانا سیماب اکبرآبادی سے اسی وقت سے نیاز حاصل ہے جب سب سے پہلی مرتبہ ساغر صاحب نظامی ۱۹۲۴ء میں لکھنو تشریف لائے تھے اور غریب خانہ ہی پر قیام فرمایا تھا۔ آپ کے جانے کے عبد ہی سیماب صاحب بھی تشریف لائے اور پھر سیماب صاحب کے ہمراہ ہم کو بھی گورکھپور جانا پڑا تھا۔ عجیب سفر تھا۔ راستہ بھر سیماب صاحب مون برت رکھے رہے۔ سیماب صاحب اپنی ذاتی علالتوں' افکار اور خواہ مخواہ کی لادی ہوئی پریشانیوں کا ہمیشہ ایک مجموعہ نظر آئے۔ ایک آدھ مرتبہ ہم نے مولانا کو ہنستے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ لیکن یا تو اخلاقاً یا انتظاماً۔ کبھی یہ بات بیساختگی کے ساتھ نظر نہیں آتی۔ اپ پر کبھی کبھی تو یہ شبہ ہوا ہے کہ خلوص برت رہے ہیں اور کبھی کبھی یہ اندیشہ ہوا ہے کہ جل رہے ہیں۔ اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ دونوں میں سے کون سی بات سچی تھی۔

مولانا ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ میں نے ان کے ایسے ''ایور ریڈی'' شاعر بہت کم دیکھے ہیں۔ ہر وقت جس تعداد میں کہئے شعر کہہ کر رکھ دیں۔ گویا شاعری ان کے لیے دال بھات ہو کر رہ گئی ہے۔ پڑھتے ایک خاص انداز سے ہیں۔ جس کی میں نہایت لاجواب نقل اتارتا ہوں اور اس نقل کے مطابق اصل ہونے کی داد خود ساغر صاحب دے چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سیماب صاحب کے سامنے مکر جائیں۔

سیماب صاحب میں بے شمار خوبیاں ہیں۔ میں ان کی قابلیت' ان کی قادر الکلامی ان کی سخن سنجی و سخن فہمی وغیرہ کا دل سے معترف ہوں۔ البتہ ایک عیب بھی ہے جو اکثر ان کے نام کے ساتھ لگا رہتا ہے یعنی ''علامہ'' مگر میرا خیال ہے کہ اس عیب کو مولانا خود بھی اچھی نظر سے نہ دیکھتے ہوں گے۔ البتہ شکایت یہ ہے کہ اگر کوئی آپ کو ''علامہ'' لکھتا ہے تو آپ چپ کیوں رہ جاتے ہیں۔ اس پر توہین کا مقدمہ کیوں نہیں چلاتے بلکہ میں تو اس سلسلہ میں فوجداری تک کو جائز سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ مولانا بھی غور فرمائیں گے۔

◆◆◆

شاد

’’دیوان الانشا‘‘ تربینی سرن شاد بی اے ایل ایل بی۔ سب جج بھوپال

یہ قصہ ہے جب کا کہ شوکت جوان تھا اور اس کی نئی نئی شادی اس طرح ہوئی تھی کہ خسر صاحب محترم مین پوری میں مقیم تھے۔ سسرال میں اپنی دھاک بٹھانے کے لیے ضروری تھا کہ مین پوری کے تمام مشاعروں میں شرکت کی جائے۔ چنانچہ ان مشاعروں سے اور تو خیر کچھ نہ ملا۔ البتہ چار دوست مل گئے۔ جگر مرادابادی‘ فانی بدایونی‘ تربینی سرن شاد اور بہاری چرن صادق۔

تربینی سرن شاد اس زمانہ میں شاعر بھی تھے اور شعر بھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ حسن والے بھی شعر کہنے لگیں تو پھر شاعر غریب کا مخاطب کون ہو‘ بہر حال ایک جوان رعنا ہنستی ہوئی جوانی اور تڑپنے والے حسن کے ساتھ مشاعروں میں چمکتا ہوا نظر آیا۔ کلام سنا تو شاد دل و دماغ میں گونج کر رہ گئے۔ یوں تو خیر آپ نے اقرار اب تک نہیں کیا ہے مگر کلام سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود بدولت بھی چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ اس زمانہ میں آپ کے دو شغل تھے۔ وکالت اور شاعری۔ معلوم نہیں وکالت زیادہ چلتی تھی یا شاعری۔ بہر حال عدالت میں دیکھنے کا اتفاق تو نہیں ہوا۔ البتہ ان وکیل صاحب کو شاعر کی حیثیت سے دیکھ کر یہی اندازہ ہوا کہ ایسے خوش مذاق انسان کو وکالت سے کیونکر دلچسپی ہوسکتی ہے۔ مین پوری کے بعد آپ بھوپال میں نظر آنے لگے۔ بھوپال میرے لیے تھانہ بھون کے بعد دوسرا وطن ہے اور تربینی سرن شاد وہاں کے سب جج۔ وہاں کی سوشل زندگی کی روح۔ وہاں کے ادبی ہنگاموں کے بہت بڑی حد تک بانی۔ نتیجہ یہی ہوا کہ بھوپال کے کسی ادبی اجتماع میں شرکت کے لیے گئے تو اپنے بھائی (ارشد علی تھانوی) کے یہاں بھی ٹھہرنے کی اجازت نہ مل سکی یا تو شاد کے یہاں رہو یا بہاری چرن صادق کے یہاں۔ یہ دونوں ٹھہرے حکام۔ ممکن ہے جیل میں رہنا پڑے۔

پہلے صاحب سلامت تھے‘ پھر دوستی ہوئی اور اب عزیز داری ہے۔ حسن کی وجہ سے تو خیر محبت سب ہی کو ہوسکتی ہے مگر شاد ویسے بھی جادوگر ہیں۔ بڈھے ہونے کو آئے بال سفید ہیں مگر مجھے اب تک ان پر پیار آتا ہے اور ان کو اس پیار پر غصہ نہیں آتا۔ ورنہ مجھے اور پیار آتا۔

تربینی سرن شاد اب شاعر کم اور جج زیادہ ہوگئے ہیں مگر شاعری ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ جب کہتے ہیں خوب کہتے ہیں۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ فنی چیز نہیں ہوتی بلکہ وارداتی چیز ہوتی ہے۔ چنانچہ میں بھی ان کو فنی داد نہیں دیتا بلکہ وارداتی دیتا ہوں۔ یہ وارداتی داد کیسی ہوتی ہے۔ یہ ایک راز ہے۔

◆ ◆ ◆

شاہد احمد

شمس العلماء خان بہادر مولوی نذیر احمد کے پوتے اور مولانا بشیر احمد کے صاحبزادے ہونے کے علاوہ مختلف بچوں کے والد ہیں۔ ہندوستان کے مشہور ترین اور مستند رسالہ ساقی دہلی کے ایڈیٹر اور ادب اردو کے سرگرم معاونوں میں سے ہیں۔

شاہد احمد صاحب کو صرف ادب سے نہیں تقریباً تمام فنون لطیفہ سے تھوڑا بہت شغف ضرور ہے۔ مثلاً موسیقی کے آپ اس حد تک دلدادہ ہیں کہ نہ صرف پکا گانا سن کر ضبط کر لینے پر قدرت رکھتے ہیں بلکہ حلق اور پھیپھڑے کی یہ ورزش خود بھی فرماتے ہیں۔ شاعری سے آپ کو ذاتی طور پر کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مگر حضرت بہزاد لکھنوی کے کلام کو ہندوستان میں صرف دو ہستیوں نے پھیلایا ہے۔ اختری بائی فیض آبادی نے گا کر اور شاہد احمد صاحب نے چھاپ کر۔ تصاویر سے آپ کو جو ذوق ہے اس کا اندازہ رسالہ ساقی کی تصاویر سے ہوتا تھا۔ ڈرامہ سے ذاتی طور پر آپ کو دلچسپی ہے۔ لکھتے بھی ہیں اور اکثر ان کے کردار بھی پیش کرتے ہیں۔ مزاح سے دلچسپی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی سے جتنا آپ قریب رہے۔ اتنا شاید ہی کوئی دوسرا رہا ہو۔ مختصر یہ کہ شاہد احمد صاحب بحیثیت مجموعی چہل پہل کے آدمی ہیں مگر ملتے تو نہایت خاموش۔ نہایت کم سخن اور کبھی کبھی خالص تاجر۔ لیکن سطح کے اس سکون کے نیچے یہ سمندر طوفانی ہے۔ جس میں خود بھی ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور جس کو چاہیں ڈبو بھی سکتے ہیں۔

◆ ◆ ◆

شمس الدین

حکیم خواجہ شمس الدین!

جو شخص لکھنو میں رہا ہو اور حکیم خواجہ شمس الدین سے نہ ملا ہو اس کے متعلق میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس کا لکھنو میں رہنا نا قابل اعتبار لکھنو کے متعلق اس کی ہر واقفیت ناقص اور لکھنو کے سلسلہ میں اس کی تمام معلومات فاتر ہے۔ حکیم خواجہ شمس الدین دراصل بجائے خود ایک شہر ہیں۔ نہ معلوم کیا کیا چیزیں آپ میں آباد نظر آتی ہیں۔ حافظ آپ ہیں اور وہ بھی صرف کلام مجید کے نہیں۔ بلکہ ہر اس کتاب کے جو آپ کے مطالعہ سے ایک آدھ مرتبہ گزر چکی ہو۔ قاری آپ ہیں۔ صرف عربی کے نہیں اردو کے بھی۔ مولوی آپ ہیں قاعدہ بغدادی پڑھانے والے نہیں بلکہ خود پڑھنے والے۔ حاجی آپ ہیں۔ حکیم آپ ہیں۔ میونسپل کمشنر آپ ہیں۔ خطیب آپ ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ کی ایک نحیف و لاغر ذات میں سینکڑوں موٹی موٹی خصوصیتیں اس طرح بھری پڑی ہیں کہ آپ کو خصوصیات کا مال گودام کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

صبح کے وقت آصف الدولہ کے امام باڑہ کے میدان میں دوڑ رہے ہیں۔ نو بجے مطب میں ریشہ خطمی، عناب ولایتی اور مویز منقی کی گردان ہو رہی ہے۔ دوپہر کو چھڑی ہاتھ میں ہے اور پیدل اس طرح سڑک پر جا رہے ہیں گویا چھڑی کو بائیسکل سمجھ کر فراٹے بھر رہے ہیں۔ سہ پہر کو میونسپل بورڈ کے اجلاس میں ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے تقریر کر رہے ہیں۔ شام کو کسی پارٹی میں چہک رہے ہیں۔ اور رات کو کسی ڈنر میں موجود ہیں۔ ایک مستقل حرکت۔ ایک مسلسل دور۔ سر میں دماغ اور پاؤں میں سنیچر۔ دماغ بھی چل رہا ہے اور خود بھی چل رہے ہیں۔ نہ وہ تھکتا ہے نہ یہ تھکتے ہیں۔ ہم آپ سب چار عناصر سے بنے ہیں۔ حکیم صاحب کے لیے ایک پانچواں عنصر بجلی بھی قدرت کو شامل کرنا پڑا۔ ہر بات میں تیزی اور تڑپ موجود ہے۔ وہ بات کریں تو آپ کی سماعت شارٹ ہینڈ لکھنا شروع کر دے۔ آپ مطلع ٹٹولتے رہیں اور وہ مقطع پر نظر آئیں۔ تیز گام اس قدر کہ منزل اور جادہ دونوں پناہ مانگیں۔ ایسا برق بلا آدمی بغیر پٹرول پیے کوئی نہیں بن سکتا۔ پھر یہ کہ ہر وقت موزون۔ آمد ہی آمد۔ آورد کا پتہ نہیں۔ میں تو حکیم صاحب کی قدر انسان کی حیثیت سے نہیں۔ یکے از عجائبات عالم کی حیثیت سے کرتا ہوں۔

◆ ◆ ◆

شہید

مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری فرنگی محلی۔

فرنگی محل لکھنو کے علمائے کرام سے عقیدت تو دوسری چیز ہے مگر محبت صرف دو سے کی۔ ایک مولوی عنایت اللہ صاحب مرحوم و مغفور۔ دوسرے ان کے بھتیجے اور میرے بچوں کے چچا مولوی صبغۃ اللہ صاحب شہید۔

مولانا دراصل میرے بھائی ارشد علی صاحب تھانوی کے دوست تھے جو امتداد زمانہ سے بعد میں میرے دوست رہ گئے۔ ایسے ذہین آدمی کا مولوی ہونا شاید بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے لیکن میں نے بہت سے ذہین مولوی بھی دیکھے ہیں۔ چنانچہ ان ہی میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ تخلصا آپ شہید ہیں لیکن سچ پوچھیے تو ہیں غازی۔ آپ کا کوئی شعر تو کبھی نہیں سنا۔ لیکن آپ کی تقریروں میں نثر کی شاعری کا لطف ضرور حاصل کیا ہے۔ تقریر اس طرح فرماتے ہیں گویا پنجاب میل شعر کہتی چلی جارہی ہے اور سننے والے کھڑے ہوئے سبز جھنڈیاں دکھا رہے ہیں۔ روانی میں سلاست اور سلاست میں روانی۔ آپ کی تقاریر کی خصوصیت ہے میلاد شریف پڑھیں یا نکاح پڑھائیں۔ خلافت فنڈ کے لیے اپیل کریں یا میونسپل بورڈ کے کسی امیدوار کی حمایت ہر قسم کی تقریر میں شاعری اپنی پوری لطافتوں کے ساتھ کھنکتی۔ زمزمے برساتی' نغمہ سرائی کرتی بلکہ کبھی کبھی ناچتی ہوئی بھی نظر آجاتی ہے۔ مولانا کو مجھ سے جو خلوص ہے اس کو میں اپنے لیے ایک طاقت سمجھتا ہوں۔ معلوم نہیں وہ میری دوستی کے متعلق کیا رائے رکھتے ہوں گے۔

◆ ◆ ◆

صادق

بہادری چرن سکسینہ صادق بی اے، ایل ایل بی۔ مگر وکیل نہیں بلکہ بھوپال میں اسسٹنٹ ایڈووکیٹ۔ جب مین پوری کو سسرال کا درجہ حاصل تھا، اس وقت وہاں کے مشاعروں میں تربینی سرن شاد اور بہاری چرن صادق ساتھ ساتھ اس طرح نظر آئے تھے جیسے اکسٹھ باسٹھ یا عین غین۔ اتحاد کی بہت سی قسمیں دیکھی ہیں۔ مگر یہ عجیب قسم پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ محمد علی، شوکت علی۔ سپرو، جیکر۔ اصغر علی، محمد علی۔ نور الٰہی، محمد عمر۔ احمد حسین، دلدار حسین۔ لارڈ اینڈ میٹو۔ غوری اور ڈکشٹ۔ عرض تو کیا کہ بہت سے اتحاد دیکھے ہیں، مگر صادق شاد یا شاد صادق، یہ شاعروں کی نئی کمپنی نظر آئی۔ نتیجہ یہ کہ دونوں سے دوستی ہو گئی۔ اب یہ کمپنی مین پوری سے منتقل ہو کر بھوپال پہنچ گئی ہے اور ہماری دوستی بھی اس کمپنی کے دفتر کے ساتھ ساتھ بھوپال میں ہے۔

صادق جتنے اچھے شاعر ہیں اس سے زیادہ اچھے انسان ہیں اور اس سے بھی زیادہ اچھے دوست ہیں۔ میں اپنے چند دوستوں کی اگر انگلیوں پر گننے والی کوئی فہرست بناؤں تو اس میں صادق بھی ہوں گے۔

بھوپال کی ادبی سرگرمیاں اس کمپنی کے سپرد ہیں اور بھوپال جا کر ہم خود اسی کمپنی کے سپرد ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ارشد صاحب کا بھی بس نہیں چلتا۔

صادق بہاری چرن ہوں یا نہ ہوں۔ مگر صادق ضرور ہیں۔ ان کے خلوص کے صدق سے کون کافر انکار کر سکتا ہے۔ ان کی شاعری دراصل ان کے خلوص کی زبان ہے۔ بہت کم کہتے ہیں مگر جو کچھ کہتے ہیں وہ شاعری نہیں بلکہ صداقت ہوتی ہے۔ پڑھتے البتہ اس بے کیفی کے ساتھ ہیں کہ سر مشاعرہ ان سے فوجداری کرنے کو دل چاہتا ہے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ شعر کہتے ہیں۔ ٹھمری یا دادرا نہیں کہتے کہ لحن بھی ضروری ہو۔

◆ ◆ ◆

صدیق

مولوی محمد صدیق....... مالک صدیق بک ڈپو لکھنو

لکھنو کے امین آباد پارک کے مشرق گوشہ کی آخری دکانوں کے پاس چلے جایئے۔ آپ کے کانوں میں ایک بلند بے تکلف اور کچھ ذمہ دارانہ قسم کی مستحکم سی آواز خود بخود پہنچ جائے گی۔ یہ آواز ہوگی مولوی محمد صدیق صاحب کی جو لکھنو کے مشہور دارالاشاعت صدیق بک ڈپو کے مالک ہیں۔ وہ اپنی درہ خیبر نما دوکان میں کچھ بدوی انداز سے بیٹھے ہوئے اپنے کسی گاہک کو سمجھا رہے ہوں گے کہ "میاں راہ نجات کیا کرو گے خرید کر' راہ نجات تو اپنے دل کو ڈھونڈنے دو اور اگر راہ فرار اختیار کرنا نہیں چاہتے تو کچھ کام کی کتابیں خریدو۔" گاہک ان کا منہ دیکھ رہا ہوگا۔ اور وہ اس کا منہ دیکھے بغیر مسلسل تقریر فرما رہے ہوں گے۔ نئے رجحانات اور نئے تقاضوں کے موضوع پر۔

صدیق صاحب کو پہلی مرتبہ دیکھنے والے مجذوب سمجھتے ہیں۔ مگر ان پر ایک آدھ گہری نظر ڈالنے کے بعد یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اس بلند ہمت شخصیت میں خلوص' نیک نیتی' محبت' مروت' فیاضی اور اسی قسم کی تمام صفات غیر منظم طریقہ پر بکھری پڑی ہیں۔ یعنی وہ اپنے بک ڈپو کی فہرست مرتب کرنے کا تو بہت اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ مگر خود اپنی خصوصیات کی کوئی فہرست تیار نہیں کی ہے۔ بیساختگی میں بڑے سے بڑا نیک کام کر جائیں گے لیکن ارادتاً تصنع تک ناممکن ہے۔ ان پر دراصل مختلف کیفیات گزرتی ہیں۔ کبھی لکھ لٹا دیں گے اور کوئلوں پر مہر ہوگی' کبھی کوئلے لٹائیں گے اور لکھ پر مہر' کبھی لکھ اور کوئلے دونوں کو محفوظ کر کے صرف مہر لٹا دیں گے۔

بہر حال میں نے ان میں دنیاداری بہت کم اور سچائی بہت زیادہ پائی۔ اگر وہ دیانتدار نہ ہوتے تو شاید اور ترقی کرتے۔ پھر بھی لکھنو میں جو سلیقہ ان کو کتابیں شائع کرنے کا ہے کسی اور کو نہیں۔ اگر پنجاب میں ہوتے تو ہندوستان کے بہت بڑے پبلشر بن جاتے۔ مگر وہ یو پی میں ہیں جہاں کتب بینی کو ایک قسم کی عیاشی کا درجہ حاصل ہے۔

◆◆◆

صفدر مرزا پوری

صفدر مرزا پوری مرحوم کا اختلاط اور ہمارا شباب ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ ہم ناسمجھی سے ہوش کی طرف آ رہے تھے اور وہ ہوش سے بدحواسی کی طرف جا رہے تھے۔ ایک ہاتھ اور ایک پیر سے تقریباً معذور ہو چکے تھے۔ سٹھیائی ہوئی باتیں کرتے تھے اور مشاعروں میں اس طرح پڑھتے تھے کہ ہم نے کبھی ان کے کسی شعر کے مصرعہ ثانی کا قافیہ اور ردیف نہیں سنا۔ شعر کے آخر تک پہنچتے پہنچتے دونوں ہاتھ پھیلا کر داد مانگنے لگتے تھے۔ لوگ ہنستے تھے اور اسی ہنسی میں شعر کی خوبی بھی گم ہو جاتی تھی۔

صفدر مرزا پوری نے اردو کی بڑی خدمت کی۔ ان کی اکثر تصانیف مشہور ہیں۔ مگر جو دور ہم نے دیکھا اس وقت وہ ایک لطیفہ بن کر رہ گئے تھے۔ لوگ ان کو پریشان کرتے تھے اور وہ اسی میں خوش تھے۔ کھانا ان کی کمزوری تھا۔ لوگ ان کو کھلاتے تھے۔ بے حد و بے حساب کھلاتے تھے اور وہ کھائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ تو وصل بلگرامی مرحوم نے ان کو اس حد تک دن بھر کھلایا کہ شام ہوتے ہوتے کالرہ میں مبتلا ہو گئے۔ اور اس ایک دن کے کھانے کے بدلے ایک ہفتہ تک مسلسل فاقہ کرنا پڑا۔ عمر کے آخری حصہ میں ناداری نے غریب کو بے حد پریشان کیا اور یہ بھولا بھالا انسان یہی تکلیفیں جھیلتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا۔

صفدر مرزا پوری اچھے غزل گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا پچھلا کلام بہت اچھا تھا۔ مگر بعد میں جب ان کو شعر گوئی ترک کر دینا چاہیے تھی۔ اس وقت بھی وہ شعر کہتے رہے۔ چنانچہ آخری دور کے اشعار۔ ان کی مشق کے زمانہ کا کلام معلوم ہوتے ہیں۔

◆ ◆ ◆

صفی لکھنوی

''لسان القوم'' مولانا سید علی نقی صفی لکھنوی۔

لکھنو کے سب سے بڑے اور ہندوستان کے بہت بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ بڑائی کے لیے صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ عزیز لکھنوی مرحوم ایسے مستند استاد کے آپ استاد ہیں اور خود تلمیذ الرحمٰن۔

صفی صاحب کے استادانہ کلام میں صرف ''داؤں پیچ'' نہیں ہوتے بلکہ لطافت شگفتگی اور زندگی بھی ہوتی ہے۔ وہ بڑے سے بڑے ٹھوس مسئلہ کو نہایت حسن کے ساتھ اپنے شعر میں پیش کر دیتے ہیں۔ تاکہ سننے والا اس بوجھ سے دب کر نہ رہ جائے بلکہ جھوم کر یہ بوجھ اٹھا لے۔

صفی صاحب سے مجھے ذاتی طور پر چند شکایتیں ہیں۔ اس لیے کہ میں ان کی عزت کرتا ہوں اور چونکہ والد صاحب سے ان کے مراسم تھے لہٰذا ڈر کے مارے منہ در منہ تو نہیں کہتا۔ البتہ چپکے سے یہاں لکھے دیتا ہوں۔ مجھے ایک شکایت تو یہ ہے کہ وہ مشاعروں میں کیوں جاتے ہیں۔ ان کے مرتبہ کے شاعروں کو مشاعروں سے بالاتر ہونا چاہیے۔ دوسری شکایت یہ ہے کہ وہ تمغے لگا کر تصویر کیوں کھنچواتے ہیں۔ یہ بات بھی ان کی بزرگی اور بلندی کے شایان شان نہیں۔ تیسری شکایت یہ ہے کہ وہ اپنی صحت کا کوئی خاص خیال نہیں رکھتے۔ ایک مرتبہ میں نے ان کو خود ان ہی کے یہاں غرقی باندھے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ آنکھوں پر عینک تھی اور جسم پر صرف غرقی۔ دور سے معلوم ہوا کہ مہاتما گاندھی صفی صاحب کے یہاں بیٹھے ہیں۔ نزدیک جا کر پتہ چلا کہ خود صفی صاحب ہیں۔

چوتھی شکایت خود صفی صاحب سے نہیں بلکہ ان کے معتقدین سے ہے کہ وہ مولانا صفی کو اقبال سے ٹکرانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ دو بڑے آدمی بغیر ٹکرائے ہوئے بھی اپنی اپنی جگہ پر بڑے آدمی رہ سکتے ہیں۔ صفی اپنی جگہ مستحکم ہیں اور اقبال اپنی جگہ اقبال۔

میں جو اشعار کبھی کبھی تنہائی میں گنگنایا کرتا ہوں ان میں مولانا صفی کا یہ شعر بھی ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

◆ ◆ ◆

ظریف لکھنوی

سید مقبول حسین ظریف لکھنوی۔

مولانا صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی اور ہمارے ایک قسم کے چچا۔ مزاحیہ شاعری میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اتنا بلند کہ بہت سے لوگ آپ کو حضرت اکبرالہ آبادی کے قریب لے جا کر دیکھتے ہیں۔ یہ وہی صفی اور اقبال والی بات ہے۔ ظریف اور اکبر کے رنگ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ زمین اپنی جگہ نہایت ضروری اور آسمان اپنی جگہ نہایت اہم۔ ظریف اپنے رنگ کے منفرد شاعر اور اکبر خود اپنی نظیر۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انیس اور دبیر کا موازنہ کرنے کے بعد سے یہ موازنہ کا مرض آخر اس قدر کیوں پھیل گیا ہے۔

ظریف صاحب کے کلام میں قہقہے اور تازیانے کچھ اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں کہ آدمی ہنس ہنس کر تازیانے کھاتا اور تازیانے کھا کر ہنستا ہے۔ وہ صرف ظریف ہی نہیں بلکہ نہایت قادر الکلام شاعر تھے۔ اپنے مطلب کی بات کہنے کے لیے شعر کو مجبور کر دیا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ شعر کی وجہ سے خود مجبور ہو جائیں۔ مزاح نہایت لطیف اشاروں سے بھی کرتے تھے اور اکثر کرتبوں سے بھی۔ لطیف اشارہ والا مزاح تو یہ تھا۔

سر پہ دستار فضیلت پاؤں میں ڈاسن کا بوٹ
بلبلاتا آ رہا ہے اشتر بغداد قوم

اور کرتب والا مزاح یہ تھا۔

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

ظریف صاحب کی ظرافت میں آمد کا عنصر غالب تھا اور بہت ہی کم آورد سے کام لیتے تھے ورنہ ان کے کلام پر ہنسنے کی بجائے رونے کو دل چاہتا۔

یوں روزمرہ کی زندگی بہت سنجیدہ۔ افکار اور امراض میں مبتلا نظر آتے تھے۔ مزاح نگاروں کی قسمت میں ذاتی طور پر رونا اور صفائی طور ہنسانا لکھا ہی ہوا ہے۔ ظریف صاحب بھی قسمت کے اسی دائرہ میں ہمیشہ محبوس رہے۔

◆ ◆ ◆

ظفر الملک علوی

مولانا اسحاق علی ظفر الملک علوی، ایڈیٹر ماہنامہ ''الناظر'' لکھنو۔

مولانا ظفر الملک علوی کو میں نے اپنے بچپن میں بحیثیت صاحب بہادر کے دیکھا تھا۔ سوٹ بوٹ، ہیٹ وغیرہ میں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھدر بھنڈار بن گئے۔ ادبی سرگرمیوں نے سیاسی سرگرمیوں کی شکل اختیار کرلی۔ آزادی کے بجائے جیل کا شوق ہوا۔ کاروبار کو سیاسی خدمات پر تج دیا۔ اور اب نہ رسالہ الناظر نہ کچھ۔ البتہ برائے نام الناظر بک ڈپو باقی ہے۔

مولانا ظفر الملک ایک آہنی قسم کے ایماندار اور ضدی سیاسی رہنما ہیں ان کی رائے اگر سب مان لیں تو خیر، ورنہ ساری دنیا ایک طرف اور وہ خود مولانا حسرت موہانی کی طرح ایک طرف نظر آتے ہیں اور سب سے لڑتے ہیں۔ ان کی لیڈری نام و نمود کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ اس میں مذہبی رنگ بھی ہے۔ مذہبی رنگ کی لیڈری میں ایمانداری ضرور شامل رہتی ہے۔

مولانا محمد علی مرحوم کو آپ پر بڑا اعتماد تھا۔ مہاتما گاندھی بھی آپ کو ایک راست باز قوم پرست سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس شخص کو دنیا کا کوئی لالچ لچکا نہیں سکتا۔ مولانا میں لچک تو ہے ہی نہیں۔ بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکرا جائیں گے اور اپنے فیصلہ پر اٹل رہیں گے۔

مجھے وہ اب تک بچہ سمجھتے ہیں۔ شوکت نہیں بلکہ پیارے محمد عمر کہتے ہیں بیوقوف بھی سمجھتے ہیں اور میں خوش ہوں کہ مجھ سے کوئی کام کی بات نہیں کرتے ورنہ خدا جانے کیا کام سپرد کردیں۔

◆ ◆ ◆

عبدالحق

مولانا انجمن ترقی اردو ڈاکٹر عبدالحق

بارہا دیکھا اور ایک مرتبہ لکھنو کے سنٹرل ہوٹل میں ملے بھی ہیں۔ مولانا آزاد سبحانی اور مولانا عبدالحق دونوں ایک ہی کمرے میں لمبے لمبے لیٹے تھے۔ وہ ان کو اور یہ ان کو چھیڑ رہے تھے۔ ہم لوگوں کے پہنچنے کے بعد بھی یہ مشغلہ جاری رہا اور دونوں نے کوشش یہی کی کہ ہم ان کے حمایتی بن جائیں مگر دو پہاڑوں کی ٹکر کا تماشا دیکھنے ہی میں عافیت تھی۔ لہٰذا ہم غیر جانبدار رہے۔

مولانا عبدالحق سے بعد میں اکثر ادبی اجتماعوں میں سرسری ملاقات ہوتی رہی مگر اردو کے لیے ان کی خدمات نے ان کو ایسا محبوب بنا دیا ہے کہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارے خاص محبوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی دودھ سے زیادہ سفید گھنی داڑھی آنکھوں میں رچی ہوئی ہے۔ عمر کافی ہے مگر ابھی تک ''کرارے'' ہیں۔ ممکن ہے یہ خصوصیت ''ہاپوڑ'' کے ہونے کی وجہ سے ہو۔ بہرحال ہاپوڑ کی دو ہی چیزیں اب تک مشہور ہوئی ہیں۔ پاپڑ اور مولانا عبدالحق۔

مولانا اردو کے بہت بڑے تنقید نگار اور کتابوں کے سب سے بڑے مقدمہ باز ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے جس قدر بھی کتابیں شائع کی ہیں، تقریباً سب پر مولانا کا مقدمہ موجود ہے۔ خواہ وہ کسی موضوع پر ہوں۔ بہرحال اردو دان طبقہ سے مولانا کا تعارف کرانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی دن کے وقت کسی آنکھ والے کو یہ بتائے کہ آفتاب گرم ہونے کے علاوہ چمکتا بھی ہے۔

◆ ◆ ◆

عبدالحلیم شرر

مجھے اس بات پر ناز ہے کہ میں نے مولانا عبدالحلیم شرر کو دیکھا ہے۔ ان کے پاس گیا ہوں اُن سے شرف نیاز حاصل کیا ہے اور ان کے انتہائی مصروف وقت پر جب جی چاہا بے تکلف چھاپہ مارا ہے اور میں ان خوش نصیبوں میں ہوں کہ مولانا کو میری حاضری سے کبھی تضیع اوقات کی تکلیف نہیں پہنچی بلکہ ایک مرتبہ تو آپ نے یہاں تک فرمایا کہ ”بھائی یا تو پابندی سے آنا چھوڑ دو یا ناغہ کرنے کی عادت ترک کرو ورنہ انتظار رہتا ہے۔“

مولانا ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے حالانکہ وہ ایک ہمہ دان ادیب تھے۔ علم کا ایک ایسا سمندر جس کی تہہ کا کوئی پتہ نہ چلتا تھا۔ تاریخ کے بہت بڑے اسکالر اور تاریخی جزویات پر پورا عبور رکھنے والے مورخ۔ دراصل عبدالحلیم شرر کی ذات کا صرف ایک پرتو ادب کے سامنے آسکا یعنی ناول نگاری باقی تمام خصوصیات کو صرف وہ دیکھ سکے جو کبھی آپ سے ملے بلکہ جن سے آپ نے بھی ملنا چاہا۔

وہ میرے ساتھ بچوں کا سا سلوک کرتے تھے اور کرنا بھی چاہیے تھا۔ وہ تو وہ ان کے صاحبزادے صدیق صاحب بھی اگر یہی سلوک کریں تو جائز ہے مگر میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ میں نے ان کی تھوڑی بہت شفقتیں حاصل کیں اور صرف ایک مرتبہ ان کی ایک کتاب ریل میں کھو کر تھوڑی سی خفگی برداشت کی۔ مولانا نے ایک مرتبہ غالباً مرزا محمد عسکری صاحب سے یا مولوی عبدالرحیم صاحب کلیم سے فرمایا تھا کہ اس لڑکے میں مصنف بننے کی روح نظر آتی ہے چنانچہ ان کا یہ اندیشہ بھی ایک حد تک صحیح نکلا۔ سچ یہ ہے کہ بزرگوں کی بددعا زندگی بھر پنپنے نہیں دیتی۔

◆◆◆

عبدالرؤف عشرت

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی....... لکھنو اور لکھنویات کے مستند راوی مانے جاتے ہیں۔ مرحوم کتابوں کی ایک تنگ و تاریک دکان میں جو چوک میں میوے والی سرائے کے سامنے تھی تمام دن بیٹھے رہتے تھے اور سہ پہر سے رات کے آٹھ نو بجے تک لکھنو کے ادیبوں اور شاعروں کا مجمع اسی مختصر سی دکان کے کمزور تختوں پر رہتا تھا۔ خواجہ صاحب کو صورت دیکھ کر مشکل ہی سے ادیب کہا جا سکتا تھا۔ گفتگو سے بھی کتب فروش ہی معلوم ہوتے تھے مگر لکھنو کے متعلق کوئی ذکر چھیڑ دیجیے’ پھر دیکھیے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آگ کی بجھتی ہوئی چنگاری پر پٹرول چھڑک دیا۔ گھنٹوں ایک سے ایک کہانی سناتے۔ دھنیا مہری سے لے کر واجد علی شاہ تک اور واجد علی شاہ سے لے کر دھنیا مہری تک کئی بار داستان کو الٹ پلٹ کر بیان کر جاتے۔

آپ شاعر بھی تھے۔ اکثر کلام سنایا کرتے تھے مگر مشاعروں میں شاذ ہی جاتے۔ آپ نے عروض کے متعلق بھی شاعری کی پہلی کتاب’ دوسری کتاب’ تیسری کتاب قسم کی کتابیں لکھی ہیں تا کہ سارا لکھنو جو یوں بھی شاعر ہے اور بھی شاعر ہو کر رہ جائے۔

مرحوم نے ادب کی کافی خدمت کی۔ کتابیں بیچ کر بھی اور کتابیں لکھ کر بھی۔

◆◆◆

عبدالقادر

سر عبدالقادر۔

کسی سرکاری یا قانونی حیثیت سے نہیں بلکہ مخزن کے ایڈیٹر اور اردو کے محسن کی حیثیت سے آپ کا ذکر مقصود ہے۔ جب میں پہلی مرتبہ لاہور آیا تو اسی حیثیت سے آپ کو دیکھنے کا شوق تھا۔ برادر محترم ڈاکٹر محمد عمر صاحب کے ہمراہ آپ سے ملنے گیا۔ بہت مختصر اور سرسری ملاقات ہوئی۔ یہی پہلی اور تادم تحریر آخری ملاقات تھی مگر اتنی ہی دیر میں سر عبدالقادر نے متعدد مرتبہ نہایت صفائی سے قاف کو قاف کی حیثیت سے ادا کیا' کاف بنا کر نہیں۔ اور اتنی ہی دیر میں اندازہ کرا دیا کہ نام بڑے اور درشن تھوڑے والا معاملہ نہیں ہے بلکہ نام اور درشن دونوں بڑے ہیں۔ اب میں پنجاب میں ہوں' اگر ادبی مجلسوں اور مشاعروں میں شرکت شروع کر دی تو سر عبدالقادر کہیں نہ کہیں صدارت کرتے ہوئے پھر نظر آ جائیں گے۔ بہرحال مخزن کے پرانے فائل اگر کبھی مل جاتے ہیں تو میں سر عبدالقادر سے گھر بیٹھے ہی نہایت محبت سے مل لیا کرتا ہوں۔

◆◆◆

عبدالماجد دریابادی

مولانا عبدالماجد دریا مدیر ''صدق وسچ''

اس وقت بالکل یاد نہیں آرہا ہے کہ مولانا عبدالماجد سے سب سے پہلے کب ملا تھا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ جب آپ رسالہ نگار اور مولانا نیاز فتح پوری کے خلاف معرکہ آرا تھے اس وقت بڑی بڑی گرم گرم متعدد ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اس کے بعد تفصیلی ملاقاتیں اس وقت ہوئیں جب میں روزنامہ ''حق'' کے عملہ ادارت میں تھا۔ مولانا کا اخبار ''سچ'' بھی وہیں سے شائع ہوتا تھا اور مولانا اکثر تشریف لاتے رہتے تھے۔ آپ ہی کے مشورے سے عبدالرؤف صاحب عباسی نے رسالہ'' کائنات'' میری ادارت میں نکالنا شروع کیا تھا۔

پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ رہا کہ میں لکھنو ریڈیو میں تھا اور مولانا وہاں سے تقریریں نشر فرمانے تشریف لاتے رہتے تھے۔

مولانا بہت ہی بلند پایہ طنز نگار بھی ہیں۔ ہر چند کہ فلسفہ آپ کا خاص موضوع ہے مگر فلسفی جب شوخی پر اتر آئے تو وہ نہایت خطرناک طنز نگار بن جاتا ہے ان کی مقفع رنگین عبارت میں اس بلا کا طنز ہوتا ہے کہ رونے یا ہنسنے کا فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔

مولانا کی زندگی بھی عجیب معمہ ہے۔ دیکھئے تو زاہد خشک۔ پڑھیے تو ایک سرشار ادیب' مفہوم ٹھوس' عبارت رنگین' الفاظ سنجیدہ' بندشیں ہنستی کھیلتی ہوئی۔ لکھتے ہیں نثر اور کرتے ہیں' نثر میں شاعری۔ لکھیں گے بڑی سے بڑی بات اور خط ہوگا۔ وہ جس سے چاول پر قل ھو اللہ لکھی جاتی ہے۔ خود عینک لگاتے اور اپنی تحریر سے دوسروں کی آنکھیں پھوڑتے ہیں۔ مولانا محمد علی' اکبر الہ آبادی' مرزا رسوا اور اقبال سے بے حد متاثر ہیں اور خود خدا جانے کتنوں کو متاثر کر چکے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ راقم بھی ہیں۔

◆ ◆ ◆

عزیز لکھنوی

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی مرحوم

سب سے پہلے عزیز لکھنوی مرحوم کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب علی برادران اپنی پہلی نظر بندی سے رہا ہو کر لکھنو آئے تھے۔ ان کا جلوس نکلا تھا۔ جس میں مسلمان مہاتما گاندھی کی جے کے نعرے بلند کر رہے تھے اور ہندو اللہ اکبر کے نعرے۔ اسی سلسلہ میں شام کو رفاہ عام کلب میں جلسہ تھا۔ مولانا عزیز لکھنوی نے ایک نظم پڑھی تھی جس کا ایک مصرع اب تک یاد ہے۔

یوسف کی قید سلطنت مصر بن گئی

عزیز نہایت خوش الحانی سے نظم پڑھ رہے تھے اور دس بارہ ہزار آدمیوں کے مجمع میں خاموش لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔

اس کے بعد لکھنو کے مشاعروں میں شرکت شروع کی تو عزیز لکھنوی سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ غریب خانہ پر تشریف لاتے اور میں دولت خانہ پر حاضری دیا کرتا۔ جب میں ہمدم کے عملہ ادارت میں آیا تو عزیز صاحب اکثر سید جالب دہلوی رحم علی صاحب ہاشمی اور اس خاکسار سے ملنے تشریف لایا کرتے تھے۔ عزیز صاحب کی گفتگو میں مزاح کی چاشنی ہمیشہ لطف پیدا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ مجھ کو یاد ہے کہ حضرت ابر قدوائی کے ایک نہایت تندرست یا فربہی کے مرض میں مبتلا صاحبزادے بالکل غبارے کی طرح پھولے تشریف لا رہے تھے۔ عزیز صاحب نے دیکھتے ہی کہا۔ ’’جانتے ہیں آپ یہ کیا ہے؟ یہ لکہ ابر ہے۔‘‘

عزیز کو شاگردوں کے سلسلہ میں ادب اردو کے قریبی دور کا سب سے خوش قسمت استاد کہا جائے گا۔ جوش ملیح آبادی' خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خاں اثر' چوہدری جگت موہن لال روان' چودھری رحم علی ہاشمی اور حکیم سید علی آشفتہ ایسے مشہور شاعروں کے آپ استاد تھے۔ غزل عزیز کا خاص رنگ پیش نہ کر سکی البتہ قصائد میں عزیز نے اپنے فن کے کمالات خوب خوب دکھائے اور نظم میں بھی خوب خوب چمکے۔ اگر حضرت یاس عظیم آبادی کا دل تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دیا جائے تو عزیز ہر دلعزیز بھی تھے۔

◆ ◆ ◆

عشرت رحمانی

امتیاز احمد خان عشرت رحمانی۔

عشرت رحمانی سے سب سے پہلی مرتبہ دہلی میں پروفیسر اکبر حیدری مرحوم کے یہاں ملاقات ہوئی۔ میں لکھنو سے اور حکیم یوسف حسن صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور سے دہلی گئے ہوئے تھے اور پروفیسر اکبر حیدری نے ایک تیر سے دو ہرن زخمی کئے تھے یعنی دونوں کی دعوت تھی۔ میرے ساتھ نسیم صاحب انہونوی بھی تھے۔ نسیم صاحب انہونوی اور حکیم یوسف حسن صاحب کے درمیان پنجاب اور یو پی کی بحث چھڑ گئی۔ اکبر حیدری ثالث بالخیر اور شوکت اور عشرت تماشائی بنے ہوئے تھے۔ یہ جنگ کھانے کے ساتھ ختم ہوئی اور اس نتیجہ پر کہ یو پی اور پنجابی دونوں میں سے کوئی ختم نہ ہو سکا۔

عشرت رحمانی سے پھر لکھنو ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی جب آپ ادبی خدمات چھوڑ کر ریڈیو کی ملازمت میں شامل ہوئے اور پروگرام اسسٹنٹ بن کر لکھنو تشریف لائے۔ رسالہ نیرنگ کا ایڈیٹر جو پہلے سے براڈ کاسٹر تھا اب ریڈیو بن گیا۔

ریڈیو میں ساتھ ساتھ ہم دونوں چار سال رہے۔ ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا ساتھ کھانا پینا ساتھ' دلچسپیاں مشترک' لڑائی جھگڑے مشترک' میل ملاپ مشترک' نتیجہ سب کا عشق۔ اب عشرت یاد آتے ہیں' وہ لڑائیاں یاد آتی ہیں' وہ ملاپ یاد آتے ہیں' وہ شرارتیں یاد آتی ہیں' وہ دلچسپیاں یاد آتی ہیں مگر عشرت لکھنو میں ہیں اور شوکت لاہور میں۔

عشرت رحمانی شدت کے وارفتہ انسان ہیں۔ ان کا کوئی بھی مشغلہ ہو' ابتدا یا اعتدال کی حد تک تو رہ ہی نہیں سکتا اور نہ وہ خود رہ سکتے ہیں۔ جب تک کہ اپنے اس مشغلہ کو انتہا تک نہ پہنچا دیں۔ مثلاً سگریٹ پینا ایک مشغلہ ہے۔ بڑے بڑے سگریٹ پینے والے ہم نے بھی دیکھے ہیں مگر عشرت کا منہ سگریٹ سے کبھی خالی نہیں دیکھا۔ غالباً اسی لیے نماز بھی نہیں پڑھتے کہ سگریٹ کیونکر پئیں گے۔ سیدھے اور الٹے دونوں ہاتھوں کی کی کلمہ کی اور بیچ والی انگلیاں دھویں سے زرد ہوتے ہوتے سرخ ہوئیں اور اب سیاہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ دن بھر میں معلوم نہیں۔ سو سگریٹ پیتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ سگریٹ کے سلسلہ میں اپ ریسرچ اسکالر بھی واقع ہوئے ہیں۔ پتھر کے زمانہ سے لے کر اب تک کس کس قسم کے سگریٹ ایجاد ہوئے ان سگریٹوں کی قیمتیں کیا کیا تھیں' خواص کیا تھیں' مزہ کیسا ہوتا تھا' ان سب پر کہئے تو دفتر کے دفتر سیاہ کر دیں۔ اور اب تک یہ حال ہے کہ نئے نئے مارکہ کی سگریٹیں بازار میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور جس دن کوئی سگریٹ دریافت کر لیتے ہیں اس دن اپنے کو واسکوڈے گاما سے کم نہیں سمجھتے۔

کام کرنے پر آئیں گے بلائے بے درماں کی طرح کام کئے ہی چلے جائیں گے۔ ایک سال کا کام ختم ہو گیا' دوسرے سال کا شروع کر دیا۔ سر جھکا ہوا ہے' سگریٹ منہ میں ہے دھوئیں کی وجہ سے آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں اور عشرت صاحب ہیں کہ لکھ رہے ہیں۔ لکھے چلے جاتے ہیں اور تیور یہ ہیں کہ لکھے چلے جائیں گے۔ باغبانی کا شوق ہوا تو کوشش یہ ہوگی کہ ڈرائنگ روم کے صوفوں میں بھی کیاریاں بنوادیں۔ طب کی طرف رجوع ہو گئے تو بوعلی سینا تک طفل دبستان نظر آنے لگے۔ سرجری' انجینیر نگ' ٹیلرنگ' ہر قسم کی بزنس۔ تمام علوم وفنون اور دنیا کے ہر قسم کے کام میں آپ کو اپنی ٹانگ اڑانا ضروری ہے۔ مثلاً بیمار ہیں علاج ڈاکٹر کا ہو رہا ہے مگر دوا اور نسخہ میں ضروری ترمیم و تنسیخ خود فرما رہے ہیں۔ بیماری بڑھ رہی ہے مگر قابلیت برابر صرف ہو رہی ہے۔ بد پرہیزی کر رہے ہیں اور جو کوئی ٹوکے تو اس کے سر ہو جائیں گے' بحث کریں گے۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سندیں لائیں گے اور یہ ثابت کر کے رہیں گے کہ یہ بد پرہیزی ہی پرہیز ہے۔ نتیجہ یہ کہ سمجھانے والا بیوقوف بن کر رہ گیا اور آپ من مانی کر کے رہے۔

عشرت میں ادبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اختراع اور تنوع ان کی طبیعت کا خاصا ہے اور ریڈیو میں بھی وہ پروگراموں کی ترتیب کے وقت اپنے اس خاصا سے کام لیتے ہیں۔ ان کا سلیقہ اور ان کی دیوانہ وار محنت ان کو ریڈیو میں بہت جلد ترقی کی آخری منزلوں تک پہنچائے گی۔ بشرطیکہ وہ خودکشی کی طرف متوجہ نہ ہو گئے اور صحت کی خرابی کو تندرستی ثابت کرنے کا شوق نہ ہوا۔

عظیم بیگ چغتائی

مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

مرزا عظیم بیگ چغتائی سے خط و کتابت تو بہت رہی مگر ملاقات صرف ایک مرتبہ ہوئی جب آپ لکھنو تشریف لائے ہوئے تھے۔ سرپنچ کے دفتر میں خود تشریف لائے اور پھر جب تک لکھنو میں رہے' کسی وقت ساتھ نہیں چھوڑا۔ نام تو عظیم بیگ تھا۔ مگر اس قدر کمزور اور دبلے پتلے تھے کہ یہ نام پھبتی معلوم ہوتا تھا۔ مرنے والے میں زندگی اس بلا کی تھی کہ موت کا گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ بات بات میں طنز' شوخی' شرارت' اگر ان کی تمام باتیں لکھ لی جاتیں جو وہ گفتگو سمجھ کر کیا کرتے تھے تو ان باتوں میں بھی بہت سی کولتار' چمکی' خانم' کھرپا بہادر اور روح لطافت وغیرہ مل سکتی تھیں۔ لکھنو کی اسی ملاقات میں آپ نے فرمایا کہ شوکت تمہارے تیسرے مجموعہ مضامین کا نام میں نے ''سیلاب تبسم'' تجویز کیا ہے۔ اس کا مقدمہ لکھوں گا۔ مجھے مضامین مرتب کر کے دے دو۔ میں نے کہا کہ بھیج دوں گا۔ کہنے لگے کہ نہیں میں لے کر جاؤں گا۔ چنانچہ مضامین لے کر گئے اور مقدمہ وہ لکھ کر بھیجا کہ خود فردوسی بن گئے اور مجھ کو رستم بنا دیا۔ ''وگرنہ یلے بود در سیستان''

میں نے ان کو لکھا کہ حضرت یہ خود آپ نے جودھ پور میں بیٹھے بیٹھے آگ لگائی ہے اور مجھ جان ناتواں کو مزاح نگاری کے پہاڑوں سے ٹکرایا ہے۔ اس سے آخر آپکو کیا ثواب ہوگا۔ میں غریب مارا جاؤں گا اور سب ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ جواب آیا کہ مقدمہ حرف بہ حرف چھپے گا اور بس اور کچھ میں نہیں جانتا۔ چنانچہ اس حکم کی حرف بہ حرف تعمیل کی گئی۔ مقدمہ چھپا۔ عرض حال میں میں نے لیپ پوت کی کوشش کی مگر برا ماننے والے برا مان ہی گئے۔

عظیم بیگ چغتائی نے بستر علالت بلکہ بستر مرگ سے بھی مجھ کو خط لکھے مگر میں جودھ پور نہ جا سکا۔ ان کی موت نے صرف ایک بڑا مزاح نگار ہی اردو سے نہیں چھینا بلکہ میری رائے میں تو ان کا مستقبل مزاح نگاری ہی نہیں بلکہ کچھ اور ہی تھا۔ ایک بہت بڑا مصنف ایک بہت بڑا مزاح نگار ہی بن کر رہ گیا اور موت نے مہلت نہ دی۔ عظیم بیگ چغتائی کو اگر قسمت سے عمر ملی ہوتی تو وہ برق بلا انسان تو نہ جانے کہاں پہنچ کر دم لیتا۔

◆◆◆

علی سردار جعفری

علی سردار جعفری نئے ادب کے تقریباً پرانے ادیب ہیں۔ کالج کی زندگی نے ان کو گریجویٹ پہلے بنایا یا لیڈر۔ پہلے اس کے متعلق روایات مختلف ہیں۔ بہر حال آج کل وہ گریجویٹ کم اور لیڈرز زیادہ نظر آتے ہیں بلکہ اب تو چہرے پر کالج سے زیادہ جیل خانہ برستا ہے اور کبھی کبھی جب بہت ہی بشاش ہوتے ہیں تو روس برسنے لگتا ہے۔ ترقی پسند ادب کے حامیوں سے ہیں۔ رسالہ ''نیا ادب'' لکھنو کی مثلیث میں آپ بھی شامل تھے۔ یعنی سبط حسنؔ مجاز اور علی سردار جعفری۔ ان میں سے باپ کون ہے۔ بیٹا کون اور روح القدس کون؟ یہ چونکہ ایک مذہبی سوال ہے۔ لہذا کسی ترقی پسند مصنف سے نہیں کیا جا سکتا چنانچہ یہ سوال فی الحال معمہ ہے۔

علی سردار جعفری افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ آپ کے افسانے پڑھے تو ہیں مگر یاد نہیں۔ کلام سنا ہے وہ ترقی پسند ہوتا ہے مگر جو لوگ ترقی پسند نہیں ہیں۔ ان سے بھی داد حاصل کر لیتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات ترقی پسند طبقہ پسند نہ کرتا ہو۔ مگر میری رائے میں جعفری صاحب کو اپنی شاعرانہ صلاحیت کو نظر بند نہ کرنا چاہیے۔ ترقی پسند ادب بھی اس کو منع نہی کرتا کہ ایک ترقی پسند ادیب شاعری بھی کرتا رہے۔ بہت سے ترقی پسند شاعر یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ خواہ شاعر باقی رہیں یا نہ رہیں مگر ترقی پسند ضرور رہیں۔ شکر ہے کہ علی سردار جعفری اب تک ان لوگوں میں نہیں ہیں۔

◆ ◆ ◆

علی عباس حسینی

علی عباس صاحب حسینی سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی۔ وہ عہد حاضر کے صف اول کے افسانہ نگاروں سے ان کو جو کچھ پڑھا جاسکتا ہے اگر وہ واقعی ایسے ہی ہیں تو ان کا درجہ اور بھی بلند ہونا چاہیے۔ گھریلو زندگی میں وہ افسانہ نگار کم اور افسانوں کے ہیرو زیادہ نظر آتے ہیں۔

ان سے بس اتنے ہی مراسم ہیں کہ ان کے اخلاق کی تعریف کروں' ان کی بذلہ سنجی کی داد دے دوں' ان کی ہنستی ہوئی آنکھوں کے سلسلہ میں واہ کہہ دوں۔ البتہ کبھی کبھی وہ پروفیسر بھی نظر آنے لگتے ہیں اور اس وقت عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ اگر آدمی اپنے کو طالب علم بنانا نہیں چاہتا تو آنکھ بچا کر بھاگ نکلے۔ یہ نوبت اگر آ گئی تو ممکن ہے کہ تعلیم کا سلسلہ طول کھینچ جائے اور طالب علم کو مکتب کا طالب علم بن کر مرغا تک بننا پڑے۔

علی عباس صاحب حسینی اگر پروفیسر نہ ہوتے' صرف افسانہ نگار ہوتے تو ان سے بہت ہی بلند توقعات ہو سکتی تھیں۔ پھر بھی وہ افسانوں میں نئی نئی راہیں تو پروفیسر ہوتے ہوئے بھی نکال ہی لیتے ہیں۔

◆◆◆

فانی بدایونی

شوکت علی خان فانی بدایونی مرحوم

سب سے پہلے میں مین پوری کے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد آگرہ میں، پھر بھوپال اور لکھنو میں ملے اور اب قیامت میں ملیں گے۔

فانی ممکن ہے کہ زندگی میں فانی ہوں مگر مرنے کے بعد تو باقی ہیں۔ ان کی شخصیت زندہ ہے اور زندہ رہ کر جو زندگی ان کے حصہ میں رہ گئی تھی اس سے بہر حال اب زیادہ زندہ ہیں۔

فانی شاعر تو جیسے کچھ بھی تھے اس کو میں کیا دنیا جانتی ہے لیکن بحیثیت ایک انسان کے ان کی بلندی شاعری سے بھی کچھ اوپر ہی تھی۔ نہایت خوددار، غیور اور آن بان کے آدمی۔ تکلیفوں پر تکلیفیں جھیلیں گے۔ مگر شکایت کبھی نہیں۔ انتہائی ضرورت کے وقت بھی اپنی قیمت کبھی گرا کر قبول نہیں کی۔ آخری مرتبہ جب میں ان سے لکھنو میں ملا ہوں تو وہ خود مردہ اور ان کی موت زندہ نظر آتی تھی۔ اپنے بعض دوستوں کے شاکی تھے۔ مگر نام اپنی زبان سے نہ لیتے تھے۔ میں نے چاہا کہ ریڈیو پر اپنا کلام نشر کر دیں۔ شبہ ہو گیا کہ شاید میں ضرورت مند سمجھ کر ایسا کہہ رہا ہوں۔ خفا ہو گئے اور پھر بمشکل تمام یہ غلط فہمی دور ہو سکی۔ مگر ریڈیو پر جانے کے لیے راضی نہ ہوئے۔

فانی کبھی کبھی زندگی میں بھی زندہ ہو جایا کرتے تھے۔ اور اس وقت دل بھی یہی چاہتا تھا۔ ‘‘وہ کہیں اور سنا کرے کوئی’’ ہنستے تھے۔ ہنساتے تھے۔ کھلنڈرے پن کی حد کو پہنچ جایا کرتے تھے۔ مگر پھر تھوڑی دیر کے بعد یہ زندگی ختم اور اپنا تخلص بن کر رہ گئے‘ یہاں تک کہ مستقلاً اپنا تخلص بن گئے۔

◆ ◆ ◆

فرید جعفری

سید فرید جعفری مچھلی شہری

الہ آباد کے مشاعرے میں ایک شعر پر یونیورسٹی کے ایک طالب علم کو غش آ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ مشاعرے کے سیکرٹری ہیں اور نام ہے سید فرید جعفری۔ ہم نے غور کرنا شروع کر دیا کہ اس موقع پر سخن کو داد دینا چاہیے یا سخن فہمی کو آخر میں طے یہ ہوا کہ اس معاملہ کو غلط فہمی کے سپرد کر کے چپ ہو رہو۔

فرید صاحب سے یہ پہلی ملاقات تھی جوان کے غش اور ہماری حیرت سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد فرید صاحب کے افسانے گھر بیٹھے پڑھتے رہے۔ بیہوش ہو جانے والے فرید کے افسانوں میں کافی کلوروفام ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اطلاع ملی کہ آپ کی اہلیہ انتقال ہو گیا۔ میں نے تعزیتی خط بھیج دیا۔ پھر خبر آئی کہ فرید رسالہ ''نیرنگ خیال'' لاہور کے ایڈیٹر ہیں۔ لاہور آیا تو ان سے بھی ملا۔ نیرنگ خیال کے دفتر میں میز پر مختلف قسم کے پائپ رکھے بیٹھے تھے۔ غالباً یہ طے کر رہے ہوں گے کہ کون سا پائپ وقت اور موسم کی مناسبت سے رومان انگیز ہو سکتا ہے۔ دونوں گلے مل گئے۔ شکوے، شکایتیں، محبتیں، دعوتیں اور بیچ بیچ میں حکیم یوسف حسن۔

لاہور کی اس ملاقات کے بعد شملہ کے مشاعرے میں فرید صاحب نے پکڑ لیا کہ اگر تم کہیں اور ٹھہرو گے تو مفت میں فوجداری ہو گی۔ لہٰذا آپ ہی کے یہاں قیام کیا۔ ایک ہفتہ بڑے لطف میں گزرا۔ شملہ سے واپسی پر کچھ دنوں کے بعد اطلاع ملی کہ فرید لندن گئے۔ لیجئے قصہ ختم۔ اچھا خاصا آدمی تھا لندن بھیج دیا گیا۔

کچھ دنوں کے بعد اطلاع موصول ہوئی کہ فرید لندن سے آ گئے ہیں۔ شادی کر کے میم لائے ہیں اور باقاعدہ ولایتی جرنلسٹ بن گئے ہیں۔ چنانچہ آل انڈیا ریڈیو کے انگریزی رسالہ انڈین لسنر کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ اس ولایتی شادی کی خبر پڑھ کر میں نے فوراً فرید کو ایک تفصیلی خط لکھا۔ ''بنام او کہ داماد فرنگ است'' فرید نے اس خط کو رسالوں میں چھپوا دیا اور مجھے خط لکھا کہ سودیشی ریل کے بعد تمہارا مزاحیہ شاہکار یہی خط ہے۔ میں دہلی جا کر فرید سے ملا، حالانکہ ملنا تھا مسز فرید سے۔ مسز فرید کو دیکھا اور فرید کی خوش قسمتی پر ایسا غصہ آیا کہ میں کیا کہوں۔ دیوی قسم کی بیوی صحیح معنوں میں شریمتی جی۔ معلوم نہیں یہ ولایتی مسز فرید فرشتوں کی کس غلطی کے ماتحت ولایت کی ڈاک میں تقسیم ہو گئی تھیں ورنہ دراصل خالص ہندوستانی خمیر ہے۔ وہی بہو بیٹیاں کا سا انداز، ولایتی جسم پر دیسی ساری باندھے ہم سب کی عزیزہ بنی ہوئی نظر آئیں اور فرید پائپ منہ میں لیے ہوئے بدستور ہکلاتے ہوئے ملے۔ فرید اگر ولایت سے جرنلسٹ ہو کر بھی نہ آتے اور صرف یہ

بیوی ہی لے آتے تو ان کا یہ سفر کامیاب سمجھا جاتا۔ مبارک ہے وہ سفر جو زندگی کے سفر کی ایسی رفیقہ مہیا کرے۔

خدا کی دین کا پوچھو فرید سے احوال
کہ جان دینے کو جائیں تو زندگی مل جائے

فرید اب تک ایسوسی ایٹڈ پریس میں تھے۔ اب سنا ہے کہ خود اپنا کوئی انگریزی اخبار نکال رہے ہیں۔ وہ جو چاہے کریں ان کو ہر حال میں ان کا ساتھ دینے والی رفیقہ حیات مل گئی ہے۔ لہٰذا زندگی کی کسی منزل میں ناکام نہیں رہ سکتے۔ اب تو ماشاء اللہ صاحب اولاد بھی ہیں اور ریڈیارڈ۔ کپلنگ کے قول کی عملی تردید کر رہے ہیں کہ ”مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، یہ کبھی نہیں مل سکتے۔“

◆◆◆

فراق گورکھپوری

پروفیسر رگھو پتی سہائے فراق گورکھپوری

الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر، شاعر، نقاد، براڈ کاسٹر اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ مگر آدمی بہت دلچسپ ہیں۔ نہایت خطرناک قسم کے بے تکلیف وہ حد تک منہ پھٹ، بلائے بے درماں قسم کی دوستی کرنے والے اور اصول پر اڑ جائیں تو دوست سے بھی رعایت نہ کریں۔

فراق صاحب سے ملاقات تو بہت پرانی ہے۔ جب ہم ہمدم کے عملہ ادارت میں امتیاز احمد اشرفی مرحوم تھے اور فراق صاحب سے ان کے بے حد مراسم تھے۔ مگر بے تکلفی ابھی نوعمر ہے۔ بھوپال کے مشاعروں میں صادق اور شاد کے مہمان صرف تین ہوتے ہیں ان میں سے دو فراق اور شوکت ہیں اور تیسرے نانک لکھنوی جو مہمان بننے کو اپنا ذاتی حق سمجھتے ہیں۔ فراق سے جب کبھی اس قسم کا وصل حاصل ہوا اس وقت ان کی بے تکلف باتوں کا لطف آتا ہے۔ آنکھیں نکال نکال کر، ہاتھ اور گردن مٹکا مٹکا کر اور زبان کو اینٹھا اینٹھا کر ہر لفظ پر ایسا زور دیں گے کہ یہ سمجھنا دشوار ہو جائے گا کہ اس میں سے کون سا لفظ اہم ہے۔ شعر کہتے بہت عمدہ ہیں اور پڑھتے بہت برا ہیں۔ مگر جوان کا رنگ ہے وہ اسی قسم کے پڑھنے میں نمایاں ہو سکتا ہے۔ دماغ اور دل دونوں ان کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ وہ سمجھا سمجھا کر پڑھتے ہیں۔ گا کر اپنے کلام کی اہمیت کو کم کرنا نہیں چاہتے بعد میں اگر کوئی ان کے اشعار گا کر پڑھے تو اس کو خود اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کلام گا کر پڑھنے والا ہے ہی نہیں پڑھ کر سمجھنے والا ہے۔

◆ ◆ ◆

فکر

مولانا ابن الحسن فکرؔ ایم اے سے اخبار تیج دہلی کے دفتر میں ہمیشہ ملاقات ہوئی اور ہمیشہ ان کو کام میں مصروف پایا ہے۔ مگر جب کبھی ملاقات ہوئی ہے یہ ضرور ہوا ہے کہ آپ نے اپنا کام ملتوی کر کے خلوص برتنا شروع کر دیا ہے۔ زبان میں شدت کی لکنت اور قلم میں بلا کی تیزی ہے ورنہ ان ہی کے دفتر میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے اور قلم ہکلاتا ہے۔

فکر صاحب ایک اہل فکر شاعر ہیں مگر فطرت نہایت بے فکر پائی ہے ورنہ وہ تو خدا جانے اور کیا کیا ہو سکتے تھے۔ ایک کہنہ مشق اخبار نویس، ایک مشاق ادیب اور ایک خوش گو شاعر ہونے کے علاوہ بہت دلچسپ دوست بھی ہیں۔ دفتر میں نہایت بے رنگ اور دفتر کے باہر نہایت رنگین یار باش اور ہر محفل میں سج جانے والے انسان جرنلزم نے بہت سے زندہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور ان ہی میں سے ایک فکر بھی ہے۔

◆◆◆

قدیر لکھنوی

قدیر احمد خان قدیر لکھنوی۔۔۔۔۔۔ لکھنو کے چند مایہ ناز شعرا میں سے ایک ہیں۔ خوب کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ لکھنو کی مشہور ادبی انجمن بہار ادب کے سیکرٹری اور لکھنو کی شاعرانہ فضا کے بغیر سیکرٹری بنے بھی بہت حد تک ذمہ دار ہیں۔ سراج اور قدیر کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے گویا یہ بھی کسی کارخانہ کا سائن بورڈ ہیں۔ محمد ابراہیم' محمد اسحاق' اصغر علی' محمد علی' بینی مادھو شمبھو ناتھ' قدیر لکھنوی' سراج لکھنوی۔ مگر ان دونوں میں واقعی اتحاد بھی چشم بددور ایسا ہے کہ دیکھنے والوں کو یہ الگ الگ نظر ہی نہیں آتے۔

قدیر لکھنوی کے بہت اچھے شاعر ہیں۔ یوں ہر صنف سخن پر قدرت رکھتے ہیں مگر غزل میں پوری طرح کھلتے ہیں۔ موسیٰ اور طور کا افسانہ ان کی ہر غزل میں دہرایا جاتا ہے مگر ہر مرتبہ ایک نئے اسلوب سے۔ قدیر صاحب کو چاہیے کہ ایک در گیر و محکم گیر کے اصول پر چلتے ہوئے اس موضوع کو اپنے نام سے مخصوص کر لیں۔ اگر یہ موضوع آپ کے نام رجسٹرڈ ہو گیا اور جملہ حقوق بنام قدیر لکھنوی محفوظ ہو گئے تو کلیم وسینا' موسیٰ و طور والے مضمون کو کوئی اور نہ باندھ سکے گا اور یہ مضمون خود آپ سے بندھ کر جائے گا۔

قدیر لکھنوی۔ دن کو ریلوے کے دفتر میں اور رات کو کسی نہ کسی مشاعرے میں اور اتوار کے دن سراج صاحب کے ساتھ۔ ہر اس جگہ جہاں سراج کی قسمت میں جانا لکھا ہوا نظر آتے ہیں۔ ریل اور شعر میں بظاہر کوئی مناسبت تو نہیں مگر پیٹ اور ذوق کے متعلق اکبر نے آخری بات کہہ دی ہے۔

دل ہے ایران اور ترکی میں
پیٹ مصروف ہے کلرکی میں

◆ ◆ ◆

کرشن چندر

کرشن چندر ایم اے، مشہور افسانہ نگار جو بجلی کی طرح ادب کے مطلع پر کوندے اور ایک ہی تڑپ میں پوری تابناکی سب کو دکھادی۔ منشی پریم چند کے بعد شاید ہی کسی کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی ہو جو دیکھتے ہی دیکھتے کرشن چندر نے حاصل کر لی۔

بڑی دھوم تھی۔ بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا، مگر جب ریڈیو کے افسران اعلیٰ نے آپ کا تبادلہ لکھنو کیا اور آپ لکھنو تشریف لائے اور صورت دیکھی تو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ یہی وہ مشہور افسانہ نگار کرشن چندر ہو سکتا ہے جس کو کم سے کم مولانا شوکت علی کے ڈیل ڈول، مالوی جی کے رکھ رکھاؤ اور کچھ نہیں تو نانا فرنویس کی عمر کا آدمی ہونا چاہیے تھا مگر یہ تو ایک پستہ قد، خاموش خاموش سا، جوان العمر کالج سے تازہ وارد قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ داڑھی مونچھ صاف، مگر داڑھی روز بنتی ہے اور مونچھ ہفتہ وار بلکہ اگر دونوں ہفتہ ہو جائیں تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ شروع شروع میں اگر کچھ اونگھا بھی کرتے تھے۔ مگر رفتہ جاگ اٹھے، پہلے ایک آدھ بات ہوئی۔ پھر ذرا گہری باتیں ہونے لگیں اور آخر میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ کرشن چندر ہی اس کتاب ''شیش محل'' کے سب سے پہلے محرک ہوئے۔ اس کتاب کی فہرست میں نے مرتب کی اس میں ترمیم و تنسیخ انہوں نے کی۔ خیال یہ تھا کہ وہ ساتھ تو ہیں ہی۔ میں لکھ لکھ کر ان سے رائے لیتا رہوں گا مگر ہوا یہ کہ وہ لکھنو میں رہ گئے اور میں لاہور آ پہنچا۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کتاب کے تخیل کو سب سے پہلے کرشن چندر ہی نے سراہا تھا اور تخیل کو واقعہ بنانے پر بھی بے حد مصر ہوئے تھے۔

کرشن چندر کی ادبی خصوصیات کسی تعارف سے بہت بلند و بالا ہیں۔ البتہ بحیثیت ایک انسان کے وہ عجیب و غریب خصوصیات کا مجموعہ ہیں۔ بچوں کی طرح معصوم فرشتوں کی طرح شریف اور شریفوں کی طرح ہر وقت نادار ریڈیو کی ملازمت اس ہندوستان کے طفیل ہے جو اپنے بڑے سے بڑے ادیب کو بھی فارغ البالی نہیں دے سکتا۔

کرشن چندر کی شخصیت بعض حیثیتوں سے معمہ بھی ہے۔ مثلاً بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ شادی شدہ ہیں یا نہیں۔ وہ ترقی پسند ادیب ہیں یا محض ادیب یا محض ترقی یا محض پسند...... میرے خیال میں وہ جیسے بھی ادیب ہوں مگر پسندیدہ ادیب ہیں اور اگر ریڈیو کی ملازمت کے باوصف ان کا یہ مشغلہ جاری رہا تو ہندوستان کے سب سے بڑے افسانہ نگار نے جانے کی اپنے مین پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس صلاحیت کو بھی وہ ایک لطیفہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

کرشن چندر کی سب سے بڑی خوبی ان کی انسانیت ہے۔ وہ اپنے کو سب سے چھوٹا سمجھ لینے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں۔ مگر اپنے کو کسی

سے بڑا سمجھنے کا خیال ان کو بہت ہی مشکل سے بلکہ شاید پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنے ماتحتوں کے ایک کھلنڈرے دوست ہیں اپنے افسروں کے ایک غیر مطمئن ماتحت اور اپنے برابر والوں کے کبھی بزرگ اور کبھی خورد۔ کبھی خود بخود قبلہ و کعبہ اور کبھی عزیزم سلمہٗ کرشن چندر بہت سی کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں اور بہت سے کتابوں کا مصنف ان کو بننا ہے۔ لیکن ان کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ اپنے مستقبل کے قطعاً منتظر نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ان کا حال بغیر کسی انتظار کے خود ہی آیا ہے اور اسی طرح مستقبل بھی حال بن جائے گا۔

کرشن چندر بہت ہی اچھے طنز نگار بھی ہیں جس کے نمونے ان کی کتاب ''ہوائی قلعے'' میں نظر آتے ہیں مگر جو انفرادیت ان کو افسانہ نگاری میں حاصل ہے اس کو چھوڑ کر طنز نگاری کا مشورہ ان کو دینا دوستی نہیں ہے۔

◆◆◆

کلیم

مولوی عبدالرحیم صاحب کلیم مرحوم۔ میرے فارسی کے سب سے پہلے استاد اور والد صاحب مرحوم کے نہایت عزیز دوست یا عزیز دشمن۔ سیہ فام رنگ، چہرے پر ایک بال بھی نہیں۔ ہلتی ہوئی گردن۔ عجیب وغریب ناک ونقشہ، والد صاحب ان کو رنجبار کا پرنس کہا کرتے تھے اور کبھی کبھی بن مانس، سرکس کا لنگور، اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے۔ بہرحال وہ دوست تھے محبت میں جو چاہتے تھے کہہ لیتے تھے اور ہمارے استاد پر ہر پھبتی چپک کر رہ جاتی تھی وہ تھے ہی بڑے پھبتی زیب، میں ان کے گھر پر فارسی پڑھنے جایا کرتا تھا۔ نہایت بھیانک کالے کالے جسم پر صرف غرقی باندھ کر کھری چارپائی پر بیٹھے پڑھایا کرتے تھے۔ وہ ڈانٹیں یا نہ ڈانٹیں مگر خوف ہر وقت طاری رہتا تھا۔ شروع شروع میں خواب میں نظر آتے رہے مگر بعد میں کچھ عادت سی پڑ گئی تھی۔ جس طرح الہ دین اپنے چراغ والے موکلوں کا بعد میں عادی ہو گیا تھا۔

مولانا فارسی کے متبحر عالم تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور اردو میں بھی طبع آزمائی فرماتے تھے۔ آپ کا ایک دیوان بھی ہے جو سنا ہے کہ والد صاحب اور محمد علی مرحوم (مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی) نے مل کر چوک میں ایک ادرک والے سے ٹکے سیر بکوایا تھا اور وہ یہ آواز دیتا تھا کہ "ٹکے سیر ٹکے سیر، چاہے ادرک لو چاہے دیوان کلیم، ٹکے سیر ٹکے سیر" یہ نتیجہ تھا اس بات کا کہ مولانا نے دو تین سو نسخے یکمشت خریدنے پر ان لوگوں کو مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ نسخے تو خرید لیے گئے مگر ان کا مصرف یہ سمجھ میں آیا کہ مولانا کو یوں چڑھایا جائے۔ چنانچہ مولانا سے حسب دستور جنگ ہوئی جس کا نتیجہ ہمیشہ صلح ہوتا تھا۔

بہرحال یہ ایک طویل داستان ہے کہ مولانا کیونکر زینت محفل بنے رہتے تھے۔ ان غریب کے ساتھ ایسے ایسے مذاق ہوا کرتے تھے کہ اب اگر کوئی دوست اپنے کسی دوست سے ایسا مذاق کرے تو مقدمہ بازیاں اور فوجداریاں ہو جائیں۔ مگر مولانا طبعزاد گالیوں کی حد تک غصہ فرماتے اور محض بھپکیاں دے کر رہ جایا کرتے تھے۔

مولانا نے فارسی تو خیر تھوڑی بہت پڑھا دی مگر اپنی صورت دکھا دکھا کر بزدل اس قدر بنا دیا ہے کہ اب تک میں ڈراؤنے خواب دیکھ کر اچھلا کرتا ہوں۔

◆◆◆

ل احمد

لطیف الدین احمد صاحب افسانہ نگار ہیں یا خود ایک افسانہ اس کا فیصلہ کم سے کم میں نے اب تک نہیں کیا ہے۔ بچپن سے نگار میں ان کے افسانے پڑھتا رہا ہوں ان کے افسانوں کا مجموعہ انشائے لطیف میں بھی پڑھ چکا ہوں۔ طامس مور کی کتاب لالہ رخ کا ترجمہ آپ نے فرمایا ہے۔ اس کو پڑھنا کیا معنی لکھنو ریڈیو اسٹیشن پر ڈرامہ کی صورت میں پیش ہوتے وقت اس کا خود ایک کردار بن کر ادا بھی کر چکا ہوں۔ لطیف الدین احمد صاحب کو میں نے پہلی مرتبہ لکھنو ریڈیو اسٹیشن پر دیکھا جبکہ آپ اپنے دوست ملک حبیب احمد صاحب کے صاحبزادے ملک حبیب احمد صاحب کے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ ان سے بزرگ بن کر ملتے تھے۔ لہٰذا ہم سب بھی ان کو چچا سمجھ کر خورد بن جایا کرتے تھے۔ حالانکہ لطیف صاحب کی بزرگی بھی بڑی لطیف قسم کی بزرگی ہوا کرتی تھی مگر آخر سعادت مندی بھی کوئی چیز ہے خود ہم نے بے تکلف ہونا مناسب نہ سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کا یہ بہت بڑا افسانہ نگار خود ہمارے لیے ایک افسانہ بنا رہا ہے جس کو مسلسل پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر خاک بھی نہ پڑھ سکے۔

لطیف صاحب باقاعدہ شاعر نہیں ہیں مگر گیت کہتے ہیں۔ موزونیت اچھی خاصی ہے۔ اگر تاجر نہ ہوتے تو کھلم کھلا شاعر ہو جاتے مگر کسی مصلحت کی بنا پر…… ”ہیں ولی پوشیدہ اور تاجر کھلے“

یعنی اندر سے شاعر ہیں اور باہر سے تاجر۔ خدا کی شان نظر آتی ہے کہ ایسے ادبی ذوق رکھنے والے کو جسے فطرتاً نہایت غیر ذمہ دار انسان ہونا چاہیے تھا۔ قدرت نے معلوم نہیں کس طرح تاجر بنا دیا ہے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

◆◆◆

مجاز

اسرار الحق مجاز!

ردولی کے ایک مشاعرے میں ایک سینک سلائی دھان پان سوکھے سہمے شاعر سے ملاقات ہوئی' تخلص تھا مجاز اور حقیقت یہ ہے کہ خوب کہتے تھے۔

بہت دنوں کے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی سے پہلی ہی تقریر نشر کرنے گئے تھے کہ دیکھتے کیا ہیں کہ مجاز صاحب وہاں موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ آپ ریڈیو کے رسالہ آواز کے ایڈیٹر ہیں۔ مل کر بہت خوش ہوئے اور دہلی میں اس طرح ساتھ ساتھ رہے کہ ان کے شاعر یا ایڈیٹر ''آواز'' ہونے سے زیادہ ان کے ایک دلچسپ اور اپنی ہی قسم کے ایک آدمی ہونے کا پتہ چلا اور دونوں طرف سے محبت کا اعلان ہوگیا۔ پھر کیا تھا' پھر تو ہر مرتبہ دہلی آ کر مجاز صاحب کے ساتھ ہی رہتے۔ ان کے گھر علی گڑھ بھی ان کے ساتھ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مراسم سنگین حد تک بڑھ گئے۔ لکھنو میں بزرگ محترم خان بہادر سید عین الدین صاحب کے یہاں ایک صاحب سے پہلے ہی ملاقات ہو چکی تھی۔ جن کا اسم گرامی ہے خان صاحب مولوی سراج الحق مگر یہ پتہ نہ تھا کہ یہی مجاز صاحب کے والد ہیں۔ اتفاق سے ایک دن مولوی صاحب سے مجاز کا ذکر یوں ہی چھڑ گیا۔ میں نے مجاز کی بہت سی تعریفیں اور ایک آدھ برائی کر دی۔ وہ چپ ہو رہے۔ مگر بعد میں مجاز نے سخت شکایت کی کہ اول تو باپ اور بیٹے سے یکساں قسم کی دوستی رکھنا یہی آپ کی کم ظرفی ہے اس پر طرہ یہ کہ میری شکایت کر دی والد صاحب سے۔ اس قسم کی خطرناک شرارت کے کھل جانے کے بعد آدمی بے حیائی کی کھوکھلی ہنسی ہنسا کرتا ہے۔ وہ ہنسی ہم بھی ہنس کر رہ گئے مگر اس دن سے اب تک مجاز کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ہے کہ اس شوکت کو اپنا دوست سمجھے یا اپنے والد کا دوست۔

مجاز پھر مستقلاً لکھنو میں رہنے لگے اور ان سے تقریباً روز ملاقات ہونے لگی۔ مجاز نے بحیثیت ایک شاعر کے اپنے لیے زبردستی جگہ حاصل کی۔ وہ ترقی پسند شاعروں میں سب سے آگے نہیں تو کسی سے پیچھے بھی نہیں ہیں۔ صحت کا اب تک وہی حال ہے۔ گم گشتگی بڑھتی جاتی ہے۔ مگر آرٹ ترقی کر رہا ہے اور ترقی کرتا رہے گا۔ اگر مجاز سوکھتے سوکھتے بالکل سوکھ نہ رہ گئے تو ان کو بہت بڑا شاعر بننا ہے۔

میں نے بہر حال طے کر لیا ہے کہ ان کے والد سے اب ان کے متعلق کچھ نہ کہوں گا اس لیے کہ باپ بیٹے کے تعلقات تو خیر پھر استوار ہو سکتے ہیں۔ مگر مجاز مجھ سے چوکنا رہتے رہتے کہیں کترانے نہ لگیں۔

◆ ◆ ◆

مجذوب

خان بہادر خواجہ عزیز الحسن غوری۔

نہ خان بہادر نظر آتے ہیں نہ گریجویٹ، نہ انسپکٹر آف اسکولز کوئی کہہ سکتا ہے نہ شاعر۔ صورت دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسجد سے اذان دے کر تشریف لا رہے ہیں۔ بڑی سی داڑھی، چوگوشیہ ٹوپی، لمبا سا کرتہ، اونچا سا پاجامہ، تسبیح کرتے کی جیب میں اور ہاتھ تسبیح کے اوپر۔

خواجہ صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے۔ سود کی ڈگری دینے کے بجائے محکمہ تعلیمات میں منتقل ہو جانا پسند کیا اور اب تک اسی محکمہ میں ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ سے عشق کی حد عقیدت رکھتے ہیں۔ اور حضرت مولانا مدظلہ کی توجہ نے ڈپٹی کلکٹر کو آدمی ہی نہیں بلکہ مسلمان بنا دیا ہے۔

شعر خوب کہتے اور نہایت کیف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ شعر پڑھتے ہوئے ان کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں ہیں۔ صرف زبان سے نہیں سارے جسم سے شعر پڑھتے ہیں۔ نہ داد لینے کا ہوش ہوتا ہے۔ نہ داد کی رسید دینے کا۔ خود ہی جس شعر کو جی چاہتا ہے۔ پچاس دفعہ پڑھ جاتے ہیں اور جس شعر کو جی چاہتا ہے۔ ایک ہی مرتبہ پڑھ کر رہ جاتے ہیں۔

راستہ میں کلام سنانا شروع کردیں تو یہی کیفیت طاری ہو جائے۔ موٹر پر چلاتے چلاتے غزل جو سنانا شروع کی تو موٹر قلابازی کھا گیا۔ سب کو تھوڑی، بہت چوٹ آئی اور خواجہ صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ لاحول ولاقوۃ حضرت مولانا اسی دن کے لیے شعر خوانی سے منع فرماتے تھے۔

خواجہ صاحب بہت ہی عمدہ کہتے ہیں مگر کسی غسل میں ڈھائی سو اشعار سے کم نہیں کہتے اور پھر انتخاب نہیں کر سکتے۔ کہتے چلے جاتے ہیں اور پھر کہہ چکنے کے بعد سنانے چلے جاتے ہیں۔ اشعار کے ان انباروں میں اچھے برے سب ہی قسم کے شعر ہوتے ہیں۔ مگر اچھے زیادہ اور معمولی کم۔

◆◆◆

مجنوں گورکھپوری

احمد صدیق مجنوں گورکھپوری، معلوم نہیں یہ تخلص شعر کہنے کے لیے رکھا ہے یا اپنا تعارف کرانے کے لیے۔ آپ کی پوری شخصیت آپ کے تخلص میں سما کر رہ گئی ہے۔ اس جسامت کے لیے یہی تخلص اور اس تخلص کے لیے یہی جسامت ہونا چاہیے تھی۔ نہایت ”المختصر“ قسم کے پورٹ ایبل انسان ہیں۔ گویا فطرت کی شارٹ ہینڈ میں مشاقی قسم کا جیتا جاگتا نمونہ۔ قد و قامت میں فتنہ مگر باقی تمام حیثیتوں سے قیامت۔ ادیب، نقاد، شاعر، افسانہ نگار، طالب علم، معلم، سب ہی کچھ تو ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مجنوں کو شہرت بحیثیت افسانہ نگار کے حاصل ہوئی۔ حالانکہ یہ خصوصیت اس کتب خانہ کی صرف ایک الماری ہے۔ وہ شعر کہتے اور خطرناک حد تک سمجھتے ہیں۔ گویا شعر و شاعری کے معاملہ میں سمجھدار اور خطرناک کا مجموعہ بن کر ”سمجھناک“ ہو گئے ہیں۔ پھر طرہ یہ کہ منہ پھٹ بھی غضب کے ہیں۔ آپ کا ایک شعر سن کر داد دیں گے تو دوسرا شعر سن کر ”مہمل“ بھی اس صفائی سے کہہ دیں گے کہ آپ منہ دیکھ کر رہ جائیں۔ کسی سے مرعوب ہونا تو جانتے ہی نہیں۔ البتہ اس آدھی چھٹانک کے آدمی سے بڑے بڑے پہاڑوں کو مرعوب ہوتے ہم نے خود دیکھا ہے۔

مجنوں میں دوستوں کے لیے خلوص بھی ہے۔ مگر بہت سپاٹ قسم کا۔ شروع شروع میں لوگ ان کو سنکی سمجھتے ہیں۔ مگر بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنکی تو نہیں البتہ تصنع سے بری ہو کر تہذیب کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے جو منافقانہ اخلاق اور دروغ باقانہ علم مجلس سکھاتا ہے۔ مجنوں کا دوست بننا بڑے دل گردے کے آدمی کا کام ہے۔ مگر جو کوئی دوست بن جات ہے وہ اس چھوٹے آدمی کی بڑی بڑی باتوں میں نہیں معلوم کیا کیا پاتا ہے۔

مجنوں صاحب پہلے ہمارے بھی بزرگ بنے تھے مگر رفتہ رفتہ راہ راست پر آ گئے۔ اب جب کبھی ملاقات ہو جاتی ہے تو کم سے کم ہمارا دل تو خوش ہو ہی جاتا ہے۔ ان کو خواہ کیسی ہی کدورت کیوں نہ ہوتی ہو۔

◆◆◆

محبوب طرزی

خان محبوب طرزی

طرزی صاحب سے میں اس وقت سے واقف ہوں جب میں روزنامہ ’’اودھ اخبار‘‘ کی ادارت کر رہا تھا۔ اودھ اخبار کے عملہ میں طرزی صاحب اسی وقت تشریف لائے تھے اور پھر میرے ہی ساتھ روزنامہ ہند میں اور وہاں سے میرے ہی ساتھ سرپنچ میں اور آخر میں میرے روزنامہ طوفان میں میرے معاونت کرتے رہے۔

خان بہادر محبوب طرزی ایک کامیاب مترجم‘ ایک خوش نصیب اہل دل‘ ایک ہردم تازہ افسانہ نگار اور ایک بے حد دلچسپ دوست ہیں۔ افسانہ نگاری میں تو ان کی رفتار عام افسانہ نگاروں کی سی ہے۔ مگر افسانہ گوئی میں وہ اپنے وقت کے منفرد جادوگر ہیں۔ ان کی ہر ٹھوکر میں سینکڑوں افسانے پڑے کلبلایا کرتے ہیں...... ’’اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے‘‘

’’کیوں طرزی صاحب کلکتہ کا سفر خیریت سے گزرا؟‘‘

زمین دوز مونچھوں کی بخیہ ادھیڑتے ہوئے فرمائیں گے۔ ’’جی ہاں بہت لطف میں راستہ گزرا‘ یہاں سے چلتے ہی سفر رنگین ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں پلیٹ فارم پر کھڑا ہی تھا کہ ہاوڑہ ایکسپریس آ کر ٹھہری۔ انٹر کلاس کے دروازہ پر ایک بنفشی برقعہ لہرایا اور نقاب الٹ دی گئی۔ کتابی چہرہ چمپئی رنگ۔ سنہرے رنگ کے بال اور کانوں میں فیروزئی آویزے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا ہی تھا کہ سندلیں ہاتھوں کے بے پرواجنبشوں سے مجھ کو قریب بلایا گیا۔ میں جو گیا تو کہنے لگیں کہ معاف کیجئے گا میں تو سوڈا لیمنیڈ والے کو بلا رہی تھی‘ خیر آپ آ گئے ہیں تو تشریف لائیے‘ کیا کہیں باہر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا‘ جی ہاں کلکتہ! کہنے لگے وہیں تو میں بھی جا رہی ہوں۔ آپ اسی درجہ میں بیٹھئے۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔

گاڑی چھوٹنے کے بعد مجھ سے فرمائش ہوئی کہ اسی سیٹ پر آ جایئے اور اسی طرح کلکتہ پہنچتے پہنچتے یہ حال ہوا کہ ہاوڑہ کے پلیٹ فارم پر ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میری انگلی میں ان کی انگوٹھی۔ قلی اسباب اتھار رہا تھا‘ انجن سیٹیاں بجا رہے تھے اور مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کر رہا تھا۔‘‘

یہ تو خیر لکھنو سے کلکتہ تک کا سفر تھا۔ طرزی صاحب کو تو ایسے رومان کے لیے بس ذرا سی مہلت درکار ہوتی ہے اور پھر برجستگی اس بلا کی کہ اگر آپ ان کے افسانہ کو افسانہ کہہ دیں تو برا مان جائیں۔

پٹھان ہیں مگر غصہ نہیں آتا۔ افغانستان سے آ کر لکھنو میں بس جانے کا اور کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ دوست نواز اس قیامت کے ہیں کہ کہیے تو گھر بار سب چھوڑ دیں۔ ذہین ہیں مگر ذہانت کو بخل کے ساتھ صرف کرتے ہیں۔ ان کو ایک کامیاب افسانہ نگار ہونا چاہیے تھا۔ افسانہ نگار تو خیر وہ ہیں مگر جس حد تک کامیاب ہونے کی ان میں صلاحیت ہے اتنے کامیاب نہیں۔ کوتاہ قلم بھی نہیں، لکھتے بھی کافی ہیں۔ مصوری اور نقاشی سے بھی شوق ہے۔ مگر دل کے معاملات میں اس قدر کو تکمیل کو پہنچے ہیں کہ باقی تمام ذوق باقی آئندہ ہو کر رہ جاتے یا گزشتہ سے پیوستہ کی صورت میں کسی عجیب جگہ سے شروع ہوتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی طرزی صاحب ایک قابل قدر دوست۔ ایک دلچسپ رقیب اور ایک محبت کرنے کے لائق آدمی ہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف اور بہت سے غیر مطبوعہ بلکہ غیر مرقومہ انسانوں کے بھی مولف، مترجم یا مصنف ہیں۔

◆◆◆

مخدوم محی الدین

ترقی پسند شاعروں میں میرا سب سے محبوب شاعر مخدوم محی الدین ہے۔ نہایت بدصورت آدمی۔ لیکن اپنا کلام پڑھتے وقت مجھے بے حد حسین نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قازقستان میں جابر کا شباب ہندوستانی زبان میں شعر کہنے کی طرف متوجہ ہوگیا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اپنے استالین کو بھی ہندوستانی بنادے یا اپنے ہندوستان کو بھی استالین کے لیے روس بنا کر رکھ دے۔

ترقی پسند شعراء کے کلام میں ترقی پسندی کا عنصر تو خیر غالب رہتا ہے مگر شاعری غائب ہو جاتی ہے۔ یہ بات جوش، مجاز اور مخدوم محی الدین کے کلام میں نہیں ہے۔ وہ ترقی پسند بن کر شاعر نہیں بنے ہیں۔ بلکہ شاعر تھے اور شاعری کو ساتھ لے کر ترقی پسند بنے ہیں۔ مخدوم محی الدین کے کلام میں خواہ مخواہ وہ بلینک ورس ہی کیوں نہ ہو۔ نغمہ، بندش، الفاظ، مفہوم، تخیل تمام عناصر کا امتزاج کچھ اس مناسبت سے ہوتا ہے کہ ترقی پسند شاعری کا شدید سے شدید مخالف بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک بے ساختگی ایک وجدان اور ایک تاثر ٹھوس سے ٹھوس اور بے رنگ سے بے رنگ موضوع میں بھی یہ آرٹسٹ پیدا کر دیتا ہے۔

مخدوم محی الدین میں رندانہ برجستگی اور فنکارانہ لطافت نہایت سلیقہ کے ساتھ سموئی ہوئی موجود ہے۔ اور یہی ان کی انفرادیت کی روح ہے۔

◆◆◆

مرزا محمد عسکری

مرزا محمد عسکری، بی اے

آپ کو مترجم تاریخ ادب اردو یا مصنف آئینہ بلاغت اور نوادر اردو وغیرہ کہنا میں اس لیے نہیں چاہتا کہ آپ تو بجائے خود ایک قسم کا انسائیکلو پیڈیا ہیں جو چلتی پھرتی ہے، ہنستی بولتی ہے، کھاتی پیتی ہے، سوتی جاگتی ہے بلکہ بیمار بھی رہتی ہے اور باغبانی اور تصنیف کے کام بھی کرتی ہے۔

میں نے آپ کو ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا۔ مگر آپ کی اب تک کی سب سے آخری کتاب ''من کیستم'' سے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے مجھ کو اپنے دوستوں میں سمجھ رکھا ہے۔ بہر حال بزرگ سے بھی ادب کے ساتھ دوستی کی جا سکتی ہے۔ پھر مرزا صاحب تو سراپا ادب ہیں۔

مرزا محمد عسکری صاحب نے ادب اردو پر جو احسان کیے ہیں ان کو تو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کا دل ہی جانتا ہوگا۔ مگر ان کے آرٹ کا قدردان بھی ہو تو ہمارا ایسا۔ کاش مرزا صاحب کو خبر ہوتی کہ ان کی پرستش ان کے ایک عقیدت کیش نے کس کس طرح کی ہے۔ ایک تازہ ترین واقعہ سن لیجیے۔

لکھنو ریڈیو اسٹیشن سے ایک ادبی استفسار کے لیے یہ خاکسار اور حفیظ جاوید صاحب پروگرام ڈائریکٹر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مرزا صاحب نے جس کمرے میں ہم لوگوں کو بٹھایا وہ غالباً آپ کے پوتے محمد اختر عسکری سلمہٗ کی تعلیم کا کمرہ تھا۔ اس لیے کہ جس میز کے گرد ہم لوگ کرسیاں بچھا کر بیٹھے تھے۔ وہ میز سیٹ کی تھی۔ مرزا صاحب سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی کہ یکایک آپ کو پان منگانے کا خیال آیا اور آپ وہاں سے باہر چلے گئے۔ حفیظ صاحب نے کتابوں کے ایک انبار کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ یہ مرزا صاحب کی کتاب نوادر ہے تعجب ہے کہ آپ نے اب تک یہ کتاب نہیں دیکھی۔ بہر حال میں آپ کو نذر کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے جلدی سے ایک کتاب چرائی اور مرزا صاحب کے آنے کی آہٹ پا کر گھبرا کر پتلون میں کھونس لی۔ اب حفیظ صاحب کا برا حال مرزا صاحب سے گفتگو کرنا بھی ضروری اور ہنسنا بھی مقدم اور خود ہم اس اندیشے میں کہ مرزا صاحب کہیں اس اچانک پیٹ کے ابھار کو بھانپ نہ لیں بمشکل تمام مرزا صاحب سے اجازت لے کر نکلے اور واپس آ کر اس تاریخی واقعہ کو مسروقہ نسخہ پر درج کرکے حفیظ جاوید صاحب کو پیش کر دیا۔

یہ طے ہے کہ اگر ایک کتاب مرزا صاحب سے مانگی جاتی تو وہ ضرور دے دیتے مگر لطیفوں کے اس مجموعہ کو بغیر کسی لطیفہ کے حاصل کرنا

بھی تو بدمذاقی ہوتی۔ بہرحال اس واقعہ کی اطلاع مرزا صاحب کو شاید اب ہوگی۔ جب آپ یہ تحریر پڑھیں گے۔

مرزا محمد عسکری صاحب سے مل کر اور کسی ادبی موضوع پر گفتگو کر کے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ گرمی میں دو میل تک دوڑنے کے بعد برف میں لگا کر فالسے کا شربت پی لیا ہے۔ تشنگی دور، زبان پر چٹخارہ، طبیعت میں فرحت اور آنکھیں روشن۔

مرزا صاحب میرے عزیزوں کے عزیز بھی ہیں۔ مگر وہ کسی کو اتنے عزیز نہ ہوں گے جتنے مجھے عزیز ہیں۔ ویسے تو خیر وہ عبدالعزیز روڈ پر رہتے ہی ہیں۔ مگر دراصل وہ کسب کمال کر کے عزیز جہاں ہو چکے ہیں۔

مرزا صاحب بھی مجھ سے اس قدر محبت فرماتے ہیں کہ میں ان کو خوبصورت نظر آتا ہوں۔ میں بھی اس طنز پر یہ سمجھ کر خاموش ہوں کہ اس میں مرزا صاحب کا قصور نہیں۔ دراصل محبت خود ہی نابینا ہوتی ہے۔

مرزا صاحب کچھ لکھیں یا نہ لکھیں۔ میرے خیال میں ان کی زندگی ہی ایک ادبی خدمت ہے۔ وہ ڈکشنری کی طرح اگر خاموش بھی بیٹھے رہیں تو سب فیض یاب ہوتے رہیں گے۔

◆ ◆ ◆

مشیر احمد علوی

قادری محمد مشیر احمد علوی ناظر کاکوری

یہ اتنا بڑا نام ایک ہی صاحب کا ہے۔ اس پوری سطر کو آپ نام کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ اس شجرے سے لے کر پتہ تک سب کچھ درج ہے۔

مشیر احمد صاحب علوی وغیرہ وغیرہ کو خدا نے ادیب بنا کر پیدا کیا تھا اور پیٹ نے کلرک بنا کر ایک ادیب کو مار ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اگر مشیر احمد علوی اپنے والد صاحب کی طرح کم سے کم ڈپٹی کلکٹر بھی ہوتے تو ان کی ادبی زندگی نہایت شاندار ہوتی اور اگر وہ بالکل ہی فارغ البال ہوتے تو بہت بڑے تذکرہ نگار کی حیثیت سے نمایاں ہوت۔ پھر بھی ان کو ادب سے ایسا دیوانہ وار ذوق ہے کہ باوجود کلرکی بہت کچھ لکھتے لکھاتے۔ سنتے سناتے رہتے ہیں۔ نثر میں ایک خاص شگفتہ طرز کے مالک ہیں۔ شاعری سے ذوق نہیں۔ مگر لکھنو کی انڈسٹریل ایگزبیشن کے تاریخی مشاعرے کے سرگرم سیکرٹری رہ چکے ہیں۔

خان بہادر سید عین الدین صاحب ان کو ادبی مجذوب کہا کرتے تھے اور مشیر احمد علوی کی تمام خصوصیات اسی ترکیب میں ڈھالی جا سکتی ہیں۔ وہ ایک کھوئے ہوئے سے۔ اپنی دھن میں مست قسم کے آدمی ہیں۔ دوستی بہت کم کرتے ہیں مگر تعلقات دشمن سے بھی رکھتے ہیں۔ علی گڑھ کی تعلیم نے بذلہ سنجی پیدا کر دی ہے مگر تعلیم کے آخری نتیجہ یعنی ملازمت نے تمام تیزیٔ طباعی اور صلاحیت کو کچل کر رکھ دیا ہے مگر مشیر اس حال میں بھی خوش ہیں اور جب مزاج پوچھیے ایک خاص ادا سے گردن کو جھٹکا دے کر خدا کا شکر ادا کر دیتے ہیں۔ وضع دار قسم کے لوگوں میں سے ہیں اور فطرتا نہایت غیور واقع ہوئے ہیں۔ کسی سے کسی غرض کے ماتحت تعلقات کبھی نہیں رکھتے اور اگر تعلقات پیدا کر لیتے ہیں تو پھر طبیعت دوستی کرتے کرتے اکتا جاتی ہے۔ مگر وہ کسی طرح لڑتے ہی نہیں۔

◆◆◆

ملا رموزی

حضرت مولا رموزی مشہور مزاح نگار ہیں۔ گلابی اردو آپ کا خاص رنگ پیش کرتی رہی۔ اس کے بعد کچھ سیاسی مزاح نگاری شروع فرمائی اور آخر کار شاعری بھی فرمانے لگے۔ ذہین آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر سب باتیں کرنے کی نہیں ہوتیں۔

ملا صاحب سے سب سے پہلے گوالیار کی بزم اردو میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ پھر بھوپال میں ملاقات ہوئی۔ ملا صاحب نے ادب اردو کی بہت کافی خدمت فرمائی ہے۔ مگر اب کچھ عرصہ سے خاموش ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی گلابی اردو سے اختلاف ہے۔ اس لیے کہ ان کے سفید اور خالص اردو میں لکھے ہوئے مضامین گلابی اردو سے زیادہ پسند آئے۔ وہ مزاح نگار ہیں تو زبان و بیان کو نئے دائروں میں لا کر مزاح پیدا کرنے کی کیوں سعی کریں جب کہ وہ سیدھی سادی طرح بھی شگفتگی پیدا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ گلابی اردو کو ملا صاحب نے خود بھی اپنے شایان شان نہ سمجھ کر ترک کر دیا ہے۔ اور اب بہت دنوں سے عام اور باقاعدہ زبان میں اپنے فن کو پیش کر رہے ہیں۔

◆◆◆

ملک حبیب احمد

آل انڈیا ریڈیو نے جہاں ملک پر بہت سے احسان کئے وہاں قوم پر بھی ایک احسان عظیم یہ کیا ہے کہ بہت سے ادبی قسم کے لوگوں کو ادیب بننے سے بچا لیا ہے۔ بلکہ جو ادیب بن چکے ہیں ان کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ کر گورنمنٹ آف انڈیا کا کچھ ایسا افسون پھونکا ہے کہ وہ ”آف انڈیا“ تو خیر باقی نہیں رہے ہیں البتہ ”گورنمنٹ“ ضرور بن گئے ہیں۔ اگر یہ ادب نواز محکمہ منجانب اللہ ظہور میں نہ آتا تو مردم شماری کی تعداد ادیبوں کی گنتی کا منہ دیکھتی رہ جاتی۔ اس محکمہ میں مختلف قسم کے ادیب ہیں۔ مثلاً کچھ تو وہ ہیں جن کو سابق ادیب کہا جا سکتا۔ کچھ وہ ہیں جو اب تک ادیب بنے ہوئے ہیں' کچھ ایسے ہیں جو نہ ادیب تھے نہ ہو سکتے تھے۔ مگر ریڈیو میں پہنچ کر ان کو بھی کبھی شبہ سا ہو جاتا ہے کہ کہیں ہم بھی ادیب ہی تو نہیں ہیں اور کچھ وہ ہیں جو ادیب بننے ہی والے تھے کہ عین موقع پر آل انڈیا ریڈیو نے ان کو مصیبت سے بچا کر اپنے دامن میں پناہ دی۔ اسی آخری قسم کے لوگوں میں ملک حبیب احمد کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ان کو شاید اپنے ادیب ہونے کی خبر نہ ہو۔ لیکن ہمارا مطالبہ یہی ہے کہ وہ اگر ریڈیو میں نہ ہوتے تو کسی رسالہ کے ایڈیٹر کئی کتابوں کے مصنف کسی پبلشنگ ہاؤس کے مالک یا مالک کے شریک یا کسی ایسی ہی قسم کے آدمی ہوتے۔ ان میں افسانہ نگاری کی صلاحیت اور ڈرامہ کا پورا سلیقہ موجود ہے' جو آل انڈیا ریڈیو میں اس طرح صرف ہو رہا ہے کہ آپ بحیثیت اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کے چکوں پر دستخط فرماتے تھے۔ الکوس اور پیلو کے اوقات پر مباحثہ کرتے ہیں۔ سازوں کے زیر و بم پر نقادانہ نظر ڈالتے ہیں۔ ادبی تقریروں کو حسرت سے سنتے اور ڈراموں سے دلچسپی لے کر اپنے اس ذوق کو بچوں کی طرح بھلا دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بنے بنائے ادبی آدمی کو زبردستی سرکاری آدمی بنا دیا گیا ہے۔ گویا ان کی وہ تمام تصانیف جو ظہور میں ابھی نہ آئی تھیں۔ بحق ملک معظم ضبط کر لی گئی ہیں۔

حبیب صاحب سے میرے مراسم کب سے شروع ہوئے' یہ ایک داستان ہے جس کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم دونوں کے دودھ کے دانت نہ ٹوٹے تھے کہ بھوپال میں ہم دونوں آپس میں کبڈی کی قسم کا کوئی غیر منظم کھیل کھیلا کرتے تھے جو نہ اب ان کو یاد ہے نہ مجھے۔ اس کے بعد پھر ہم دونوں نہ مل سکے اور ملے بھی تو کب جب ہم ادیب ہو چکے تھے۔ اور وہ ریڈیو دہلی سے اپنی تقریریں براڈ کاسٹ کرنے جایا کرتے تھا۔ ایک مرتبہ ایک شعلہ جوالہ سے ملاقات ہو گئی۔ خوبصورت بھی اور خوش اخلاق بھی' خوش پوشاک بھی اور بظاہر خوش باش بھی۔ معلوم ہوا کہ ہندوستانی تقریروں کے نئے انچارج آپ ہی ہیں اور اسم گرامی ہے ملک حبیب احمد۔ یکا یک خیال آیا کہ بھوپال میں ہمارے ایک بہت خوبصورت چچا تھے ملک حبیب احمد' ان سے ان کا نام بھی ملتا ہوا ہے اور شکل بھی کہیں یہ وہی

حضرت تو نہیں ہیں جو بھوپال میں آخری مرتبہ منہ چڑھا کر بھاگے تھے اور پھر ہم کو بدلہ لینے کا موقع نہ مل سکا۔ ہمت کر کے ایک گول سا سوال کر ہی دیا۔ ''ملک صاحب کیا آپ ملک حبیب احمد صاحب سے واقف ہیں جو بھوپال میں سٹی مجسٹریٹ تھے؟''

''جی ہاں خوب اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ میرے والد صاحب ہیں۔''

ایک دم بجلی کی طرح تڑپ کر گلے سے لگ گئے اور ملک حبیب احمد بھونچکا کہ آخر ماجرا کیا ہے، مگر جب ماجرا بتایا تو اب وہ نہیں چھوڑتے۔ دیر تک یہی عالم رہا۔ شکر ہے کہ اس وقت اسٹیشن ڈائریکٹر کا گزر ادھر سے نہیں ہوا اور نہ وہ اس منظر کو شاید کشتی سمجھتے۔ جس کا امکان ایک پروگرام اسسٹنٹ اور ایک ٹاکر میں ہر وقت ہوسکتا ہے۔

دہلی کی ان ملاقاتوں کے بعد لکھنو میں جب ریڈیو اسٹیشن کھلا تو ملک حبیب احمد ڈائریکٹر آف پروگرامز بنا کر بھیجے گئے۔ اس لیے کہ شین قاف سے درست تھے اور لکھنو ان کو آسانی سے قبول کرسکتا تھا۔ چنانچہ لکھنو نے ان کو نہ صرف قبول کیا بلکہ لکھنو سے تبادلہ کے وقت یہ پنجابی لکھنو کو اپنے لیے تڑپتا ہوا چھوڑ کر پنجاب آیا۔ بہر حال لکھنو کے قیام میں حبیب نے اپنے کو پڑھنے کا تفصیلی موقع دیا اور یہ راز اسی وقت کھلا کہ حبیب ادیب تھے مگر ادیب نہ بن سکے۔ ان کے مضامین نظر سے گزرے۔ ان کے فرضی ناموں سے لکھے ہوئے ڈرامے دیکھے۔ افسانے پڑھے اور آخر میں طبیعت بڑی خوش ہوئی کہ ریڈیو نے اس ادیب کو ادیب بننے سے بال بال بچالیا۔

لکھنو میں ریڈیو اسٹیشن کھلنے کے بعد اس خاکسار کو بھی ریڈیو کی ملازمت آخر کار اختیار کرنا پڑی۔

ہر چند کہ اب بھی دوستی تھی، بے تکلفی تھی۔ دفتر کے باہر وہی پرانے حبیب اور شوکت بھی تھے۔ مگر قدرتی طور پر کم سے کم ہماری طرف احتیاط ضرور پیدا ہوگئی تھی۔ اور ہم سمجھتے تھے کہ ان افسر قسم کے انسانوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ خدا جانے اپنے کو کس وقت انسان سمجھتے سمجھتے افسر سمجھ بیٹھیں۔ لہٰذا اپنے حدود میں رہنا ہی مناسب ہے۔ حدود کے اس تعین کے باوجود حبیب کے لیے دل میں ایک خلوص، بے ساختہ خلوص اور دیوانہ وار خلوص ہمیشہ محسوس ہوا۔ جس کا اظہار ملازمت کے زمانہ میں اس لیے مناسب نہ تھا کہ اس کو صاحب کی خدمت میں بڑے دن کی ڈالی سمجھا جاتا مگر اب وہ محض خلوص مانا جائے گا۔

حبیب عجیب متضاد خصوصیات کا مجموعہ ہیں۔ پرکار بھی اور سادہ بھی۔ محنتی بھی اور بعض معاملات میں انتہائی کاہل بھی۔ جتنے ذہین ہیں اتنے ہی فراموش کار بھی۔ جتنے حسین ہیں اتنے ہی حسن شناس بھی۔ جتنے صاحب دل ہیں اس سے کچھ زیادہ ہی دلبر بھی۔ حبیب کو حسین محفلوں میں دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے مگر آپ ہم ساکنان خطہ خاک کی طرح حسن پرست بنے ہوئے نظر نہیں آتے۔ بلکہ جہاں وہ دو چار حسین دیکھے معبود بن کر بیٹھ گئے اور سچ بھی ہے کہ پرستش کرے وہ جس کو پرستش کرانا نہ آتی ہو۔

حبیب دل کے بہت اچھے مگر کانوں کے نہایت کچے واقع ہوئے ہیں۔ زندگی بھر اپنی اس کمزوری پر پچھتائے ہیں۔ مگر یہ کمزوری اس

اعتبار سے جائز بھی ہے کہ ہم نشیں ہی رہزن ثابت ہوا کرتے ہیں۔ تلخ تجربے بدگمان بنا بھی دیتے ہیں اور آدمی کو خود اپنے سایہ سے بھی چوکنا رکھتے ہیں۔

آج کل حسیب تندرستی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ جسامت بڑھ رہی ہے اور خوراک گھٹتی جاتی ہے۔ ورزش کی ہمت نہیں۔ لہذا بے زبان معدہ کو نفس کشی سکھا کر خود فاقہ کشی سیکھ رہے ہیں۔ اگر جسم بغاوت کرتا رہا تو مسٹر چرچل اور کامیاب ہو گئے تو مہاتما گاندھی بن کر رہیں گے۔

حسیب فطرتا درمیانی درجہ کے قائل نہیں۔ ان کی زندگی کا نچوڑ اس مقولے میں ہے کہ اس پار یا اس پار۔

◆ ◆ ◆

نسیم انہونوی

سید محمد نسیم انہونوی مالک سرپنچ جرنلس لکھنو۔

نسیم مجھ سے اتنے قریب رہے ہیں کہ میرا کوئی اور دوست مجھ سے اس قدر قریب نہیں رہا مگر

ہزاروں قربتوں پر یوں میرا مہجور ہو جانا
جہاں سے چاہنا ان کا وہیں سے دور ہو جانا

اب وہ لکھنو میں ہیں اور میں لاہور میں۔ مگر روحانی طور پر میں ان سے اتنے فاصلہ پر نہیں ہوں وہ رسالہ ‘‘انکشاف’’ نکال رہے تھے اور میں ہمدم میں تھا کہ یہ مراسم شروع ہوئے اور شروع ہوتے ہی اس درجہ پر پہنچ گئے کہ لوگوں کو نسیم اور شوکت میں امتیاز دشوار ہو گیا۔ ہم دونوں نے مل کر رسالہ ‘‘حریم’’ اور اخبار ‘‘سرپنچ’’ نکالا اور حریم دونوں اب تک نسیم کے زیر سایہ پھل پھول رہے ہیں۔

نسیم قیامت کے ذہین اور بلا کے تجارتی آدمی ہیں۔ اگر وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے تو ان کو کسی صوبہ کی وزارت میں شامل ہونا چاہیے تھا یا کم سے کم کسی ریاست کی مدار المہامی ملتی تو وہ اپنی انتظامی قابلیت کے جوہر دکھاتے۔ وہ سرمایہ دار انہیں ہیں مگر کوئی سرمایہ دار اپنے روپے کے زور پر کسی ادارہ کو اس کامیابی سے نہیں چلا سکتا۔ جس کامیابی کے ساتھ نسیم نے سرپنچ جرنلس کو چلایا ہے۔ ان میں یہ خاص کمال ہے کہ بغیر پیسے کوڑی کے جتنا بڑا محل کہیے تعمیر کر کے دکھا دیں۔ چنانچہ برابر لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے رہتے ہیں اپنے رسالوں کے ایسے ایسے خاص نمبر نکالتے ہیں کہ لوگ ان کی مالی حالت کی طرف سے مشتبہ سے ہو جاتے ہیں۔

وہ ایک کامیاب افسانہ نگار تھے مگر تجارتی دماغ میں ادبی عنصر باقی نہ رہ سکا اور اب صرف اپنے ادارہ کے پروپرائٹر ہیں کبھی کبھی اب بھی افسانہ نگاری فرماتے ہیں۔ مگر اب دراصل خود ان کے ذاتی افسانے شروع ہو چکے ہیں۔ جن کے وہ ہیرو ہیں۔

مٹھائی کھاتے ہیں، سرمہ لگاتے ہیں۔ دن بھر ٹائپ رائٹر پر بیٹھے کاغذی گھوڑے دوڑایا کرتے ہیں اور شام کو احباب کے حلقہ میں ذرا دل بہلا لیتے ہیں۔ حسن پرست بھی ہیں اور صاحب دل بھی۔ مگر رومان کے بس اسی حد تک قائل ہیں کہ دماغ کو ذرا سکون حاصل ہو جائے ورنہ دراصل ان کو حسینوں سے زیادہ محبت ان عدالتوں سے ہے جو سمن برائے اشاعت بھیجتی ہیں اور مرتے ہیں ان مشتہروں پر جو آپ کے اخبار اور رسالہ میں اشتہار چھپواتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی حسن پرستی تو اس قدر کمزور واقع ہوئی ہے کہ ایک طرف ایک حسینہ کو بٹھا دیجئے اور دوسری طرف یہ اور بات ہے کہ امرتیاں کھا چکنے کے بعد حسینہ کے غائب ہو جانے پر رسماً ذرا سا افسوس کر لیں یا سرکہ میں ڈبو کر یا ذرا سا

شہد لگا کر کسی قتالہ عالم کو ان کے سامنے لے آئے۔ وہ حسن کو محض سرکہ اور شہد کی وجہ سے ناقابل قبول سمجھ کر منہ پھیر لیں گے۔ سرکہ اور شہد ان دونوں سے آپ کو چڑ ہے ان میں سے کسی کا نام لے دیجئے۔ مرنے مارنے کو تیار ہو جائیں گے۔

نسیم سے مجھے محبت ہے لہذا ان کی کمزوریاں میری نظر میں نہیں آ سکتیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نسیم میں کمزوریاں نہ ہوں گی بلکہ دراصل یہ میرا اندھا پن ہے کہ میں دیکھنے سے قاصر ہوں۔

◆◆◆

نیاز فتح پوری

حضرت نیاز فتح پوری مدیر ''نگار'' لکھنو

جب میں بہت چھوٹا تھا۔ اس وقت نیاز صاحب کو بھوپال میں دیکھا تھا۔ آپ کے چہرے پر داڑھی تھی اور آج کل سے زیادہ معمر نظر آتے تھے۔ پھر نیاز صاحب کو لکھنو میں دیکھا۔ جب آپ وصل صاحب بلگرامی کی دعوت پر بھوپال سے مستقلاً لکھنو منتقل ہو کر آ گئے تھے اور رسالہ ''نگار'' کا دفتر نظیر آباد میں قائم کیا تھا۔ میں وصل صاحب سے ملنے جایا کرتا تھا۔ اور نیاز صاحب سے ملنے کو دل چاہتا تھا مگر ملا اس وقت جب خود نیاز صاحب کا بھی دل چاہا۔

نیاز صاحب بہت جلد مجھ کو اپنا خاص دوست یا خورد سمجھنے لگے۔ کبھی کبھی کسی ادبی مسئلہ پر نیاز صاحب سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی پہاڑ کو موکل کی مدد سے الہ دین والا چراغ گھس کر عبور کر لیا ہے۔ نیاز صاحب کی گفتگو میں بلا کا طنز قیامت کی شوخی اور نہایت لطیف قسم کی شگفتگی ہے۔ وہ مزا نگار بن کر ادب میں نہیں آئے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ منزل بھی ان کی روندی ہوئی ہے۔ میرے دوسرے مجموعہ مضامین بحر تبسم پر نیاز صاحب ہی نے مقدمہ لکھا ہے اور میری خوب خوب خبر لی ہے۔ خیر تو خیر اب بھی جب چاہتے ہیں لیتے رہتے ہیں۔ مگر مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا نیاز صاحب مجھ کو واقعی عزیز رکھتے ہیں۔ اور میں بھی ان کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز۔ ایک چوٹی کے افسانہ نگار ہونے کے علاوہ شعر کے نہایت معتبر جوہری بھی ہیں مگر بے دھڑک تنقید اور آزادی کی حد سے بھی ایک آدھ قدم آگے بڑھی ہوئی ان کی رائے سے ڈر ہی لگتا ہے۔ نیاز صاحب میں اب کچھ کچھ بڑھاپے کے آثار نمایاں ہیں۔ مثلاً اب ان کو مکان بنوانے' بچوں کی شادیاں کرنے' روپیہ جمع کرنے اور صرف کرنے میں اونچ نیچ پر غور کرنے والا بڑھاپے کا شعور پیدا ہو گیا۔ نیاز صاحب کی وہ بے پروا ادائیں وہ چہ غم قسم کی افتاد طبیعت اور وہ ''ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا'' والی سر مستی اب نظر نہیں آتیں۔ لوگ نیاز صاحب کے مذہبی اعتقادات کی طرف سے مشکوک ہیں۔ مگر میں نے خود ان کے ساتھ روزہ افطار کیا ہے اور عید کی ایک آدھ نماز بھی پڑھی ہے۔ عید ملنے تو ہمیشہ ہی جاتا ہوں اور ان کو عید کے دن مغموم نہیں پاتا۔ رہ گئیں ان کی وہ مذہبی تنقیدیں جن سے یہ غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کے متعلق میرے ذہن میں ہمیشہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نیاز صاحب کے دل کی آواز ہے یا دماغ کی۔ میرے خیال میں وہ دل سے ٹھیٹھ مسلمان اور دماغ سے نقاد ہیں۔ لہذا دماغ کبھی کبھی دل پر حاور ہو جاتا ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ میں اس سلسلہ میں نیاز صاحب یا ان کے معترضین کے سامنے کوئی صفائی پیش نہیں کر رہا ہوں۔

◆◆◆

وصل بلگرامی

سید مقبول حسین وصل بلگرامی

وصل مر گئے؟ کیونکر یقین آئے کہ وصل واقعی مر گئے ہوں گے۔ ان کے لیے تو دنیا کی کوئی بات ناممکن تھی ہی نہیں۔ اس ہندوستانی اور مسلم نپولین کو کم سے کم میں نے کبھی کسی موقع پر مجبور نہیں دیکھا۔ بلکہ ہمیشہ یہی دیکھا کہ جس کسی دوست کو کوئی ناقابل عبور مشکل پیش آ گئی وہ امید لے کر وصل صاحب کے پاس آیا اور کامیاب واپس گیا۔ جرات کا عالم کچھ نہ پوچھئے۔ جو بات خواب وخیال میں بھی ممکن نظر نہ آئے' وصل صاحب اس کو ممکن کر کے دکھا دیتے تھے۔

کانپور ریلوے اسٹیشن پر ایک یورپین لڑکی سات آٹھ ڈریس سوٹ پہنے ہوئے ولایتی معززین کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ میں نے وصل صاحب کو یونہی کہہ دیا ''کیوں وصل صاحب ہر ناممکن بات تو آپ ممکن بنا دیتے ہیں۔ اب بتائیے کہ اس لڑکی کا بوسہ بھی آپ لے سکتے ہیں؟'' جواب کچھ نہ دیا' سفید داڑھی کھجائی' کچھ غور کیا اور آگے بڑھ گئے۔ اب میں نے خطرے کو محسوس کیا۔ آواز دی۔ واپس بلانا چاہا۔ مگر جب وہ نہ لوٹے تو خود بھاگا دوسری طرف کہ ان کے ساتھ ہی میری مرمت بھی نہ ہو جائے۔ یکایک وصل صاحب نے انگریزوں کے اس مجمع میں گھس کر اس لڑکی کی پیشانی پر چٹاخ سے بوسہ لے ہی تو لیا اور ساتھ ہی ساتھ چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا کہ ہائے بالکل یہی صورت تھی میری زہرہ کی' بالکل یہی صورت تھی' یہی قد' یہی قامت' یہی آنکھ' ناک...... لڑکی سہم گئی۔ اس کے ساتھی حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر ان میں سے ایک نے وصل صاحب کو تسلی دی اور سمجھا بجھا کر پوچھا تو آپ نے بتایا کہ میری لڑکی کا ابھی انتقال ہوا ہے' بالکل ایسی ہی تھی ہو بہو یہی۔ اب تو وہ لڑکی اور اس کے سب ساتھی وصل صاحب کے گرد جمع ہو گئے۔ کوئی رومال سے ہوا دے رہا ہے' کوئی لیمنیڈ پیش کر رہا ہے اور لڑکی آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی ہے۔ آخر میں وصل صاحب کا پتہ اس نے اور آپ نے اس کا پتہ لکھ لیا۔ وصل مرحوم بعد میں بتاتے تھے کہ کبھی کبھی خط آ جاتا ہے۔

وصل صاحب کے کارناموں میں سے ایک بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ وہ تو راستہ چلتے ایسے ایسے افسانے پیدا کر دیا کرتے تھے کہ جن پر مشکل ہی سے یقین آ سکتا تھا مگر وصل صاحب کو جاننے والے جانتے ہوں گے کہ مرحوم کے لیے واقعی کوئی بات مشکل یا ناممکن نہ تھی۔

ہر مشاعرے میں ایک ذمہ دار حیثیت کے مالک' جس تقریب میں پہنچ گئے تمام انتظام اپنے سر لے لیا۔ علی گڑھ کی جوبلی میں گئے تھے۔ ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے جو گئے تو جاتے ہی وہاں کے مہتمم بن گئے۔ اب تمام احباب کو مفت میں کھانا کھلا رہے ہیں اور بول کوئی

اس لیے نہیں سکتا کہ صورتا علی گڑھ کے بانیوں میں سے معلوم ہوتے تھے۔ داڑھی سے ایسے ایسے فائدے اٹھاتے تھے کہ آج تک اس مفید چیز کو اتنا کارآمد کسی نے نہ بنایا ہوگا۔

شعر خوب کہتے تھے۔ ایک ایک غزل میں ہندوستان کے تمام مقبول استادوں کے رنگ کے شعر موجود ہوتے تھے۔ اور پڑھتے بھی اس جوش کے ساتھ تھے۔ گویا اسی غزل سے ہندوستان کو سوراج یا اپنے کو جیل خانہ دلوا کر رہیں گے۔ چہرہ سرخ گلے کی رگیں پھولی ہوئیں۔ منہ سے کف جاری اور زانو پیٹ پیٹ کر پڑھ رہے ہیں شعر۔ دور سے کوئی آواز سنے تو معلوم ہو کہ بلوہ ہو گیا ہے یا کوئی پٹھان اپنے نالائق بیٹے کو ڈانٹ رہا ہے۔

وصل صاحب نے نہایت شاندار زندگی بھی بسر کی اور آخری دور انتہائی تکلیف میں بھی گزرا۔ مگر آخر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ کے فیض نے ان کو انتہائی متوکل بنا دیا تھا۔ بجھے ہوئے ضرور نظر آتے تھے مگر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس دنیا سے اٹھے۔

◆◆◆

یوسف حسن

حکیم محمد یوسف حسن، ایڈیٹر رسالہ ''نیرنگ خیال'' لاہور

رسالہ ''نیرنگ خیال'' لاہور کا مشہور و معروف اور ایک زمانہ میں بہترین رسالہ تھا۔ اب تک یہ رسالہ نکل رہا ہے اور اپنی شان کو قائم رکھنے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ حکیم یوسف حسن صاحب اسی رسالہ کے ہنگامہ خیز ایڈیٹر ہیں۔ میں نیرنگ خیال کا مضمون نگار اور میرا مضمون سودیشی ریل اسی رسالہ کے سالنامہ میں سب سے پہلے شائع ہوا تھا۔

حکیم یوسف حسن صاحب سے ہر سال لکھنو میں ملاقات ہوا کرتی تھی۔ آپ لکھنو میں شوکت اور حامد اللہ افسر اپنے دو دوستوں کے لیے جایا کرتے تھے۔ اور چونکہ تجارتی قسم کے آدمی ہیں لہٰذا اس سفر کو بھی تجارتی رنگ دے کر کچھ اشتہاروں کا اور کچھ خریداروں کا اور کچھ تصویروں کے انتخاب کا کام بھی کر لیا کرتے تھے اور اس کے بعد...... جی ہاں!

حکیم یوسف حسن ایک زندہ دل پنجابی، ایک ہنس مکھ ادیب اور ایک خالص تجارتی قسم کے ایڈیٹر ہیں۔ میں نے ان سے اپنے مضامین کا کبھی معاوضہ نہیں لیا تھا۔ ایک مرتبہ شامت جو آئی تو معاوضہ لے لیا مگر حکیم صاحب کے تبسم میں اس کے بعد سے جو طنز کا زہر شامل ہوا ہے۔ وہ آج تک موجود ہے وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے صرف مسکراتے ہیں۔ مگر وہ حکیم ہیں ان کو خود اندازہ ہونا چاہیے کہ اس قسم کا تبسم ایک حساس آدمی کے لیے کس قدر مہلک ہو سکتا ہے۔

حکیم یوسف حسن خود بھی افسانہ نگار ہیں۔ مگر بیچارے حکمت کریں، ایڈیٹری کریں یا افسانہ نگاری کریں۔ آخر کیا کیا کریں؟ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی ضروری باتیں ہیں۔ جن میں حکیم صاحب کا وقت بہر حال صرف ہوتا ہی ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ زندگی کے بعض لمحات گنے تو جا سکتے ہیں گنائے نہیں جا سکتے۔

◆ ◆ ◆